میرا گاؤں

میرے گاؤں کا نام نانگل تھا اور اب بھی ہے۔ نانگل اور کھیڑی دو جڑواں گاؤں تھے۔ دونوں کے درمیان ایک بند یعنی پشتہ تھا جو دونوں کو جدا کرتا تھا۔ نانگل کا پتہ کچھ اس طرح کا تھا: "موضع نانگل ڈاکخانہ کھیڑی تحصیل ناہڑ ضلع روہتک اور ریاست دوجانہ" تقسیم ہند کے وقت یہ علاقہ پنجاب تھا۔ اور اب صوبہ ہریانہ کا حصہ ہے۔ یہ گاؤں تحصیل ناہڑ سے نو میل اور ضلع روہتک سے پچاس میل سے زیادہ فاصلے پر واقع تھا۔ اس کے اطراف میں مذکورہ گاؤں اور قصبے تھے، " کھیڑی، گھڑی، پڑتل موڑی، کوسلی ریلوے اسٹیشن، بڑانگلہ، چھوٹانگلہ اور جاٹو سانہ، اس موضع میں اور اطراف میں قابل ذکر اقوام اور برادریاں رہتی تھیں۔ مسلمان راجپوت، ہندو راجپوت، ہیر اور جاٹ وغیرہ وغیرہ۔

اطراف کے دیہاتوں اور گاؤں آنے جانے کے لیے "پیدل، بیل گاڑی کی سواری، اونٹ کی سواری" اور اگر میسر آجائے تو "گھوڑا گاڑی" استعمال کرتے تھے کیونکہ تحصیل اور ضلع تک کچے راستے تھے۔

گاؤں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن جو تقریباً چار یا پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کی وجہ تسمیہ تو نہیں معلوم کیونکہ تمام بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ کس نے آباد کیا؟ اور کب کیا؟ بہر حال ریاست دوجانہ کے نواب مسلمان تھے جبکہ علاقے اور ریاست میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ گاؤں کے اطراف میں کئی قابل ذکر قلعے و سرائے تھے لیکن ان میں سے کچھ کا معلوم نہیں۔ لہذا گاؤں کے بانی اجداد کے نام وغیرہ میرے علم میں نہیں۔ ان اجداد کا نام بھی نہیں معلوم، بس اتنا معلوم ہے کہ 'خواجہ معین الدین چشتی' کے دور میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ جنگ آزادی 1857 کے دوران گاؤں میں کوئی قابل ذکر مذہبی یا سیاسی شخصیت نہیں تھی۔ بہر حال ریاست دوجانہ کا قلعہ دہلی سے تقریباً 20 سے 25 میل اور رواڑی شہر سے 9 تا 10 میل پر واقع تھا۔

گاؤں کے لوگ کسان تھے۔ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ کچھ لوگ روزگار کے سلسلے میں ہندوستان کے بڑے شہروں میں جا کر ملازمتیں کرتے تھے اور اکثر لوگ فوج میں بھرتی ہو جایا کرتے تھے۔ جیسا کہ پاکستان میں چکوال اور جہلم کے لوگ زیادہ تر فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ تعلیمی وسائل کی کمی کی وجہ سے زیادہ لوگ سپاہی بھرتی ہوتے تھے۔ اکثر جو ترقی کرتے ہوئے اپنی اہلیت پر آگے بڑھتے وہ گاؤں کو خیر باد کر دیتے تھے۔ گاؤں چھوڑ کر شہر میں بسیرا کرنے والوں نے تحریکوں میں حصہ لیا۔ جو ان کا انفرادی فعل تھا۔

گاؤں کی آبادی تقریباً ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ جس میں 99 فیصد راجپوت اور بقایا 1 فیصد نچلی ذات کے لوگ تھے۔ گاؤں میں اکثریت ہندو راجپوتوں کی تھی۔ مسلمان 25 سے 30 فیصد تھے۔ گاؤں میں اسلام قبول کرنے سے پہلے رشتہ داریاں تھیں، لہذا ہندو اور مسلمان اپنا تعلق بتاتے تھے اور گاؤں میں ہندو مسلمان ٹکراؤ نہیں ہوا۔ گاؤں میں مختلف گوتھوں کے لوگ تھے۔ جس میں چوہان، پوار اور جاٹو قابل ذکر تھے۔ چوہان گوتھ کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ گاؤں چار محلوں میں تقسیم تھا جن کے نام کچھ یوں ہے۔

- محلہ بڑی کے
- محلہ گھڑی کے
- محلہ بابے کے

- محلہ موڈے کے

اور پانے صرف دو تھے۔ 1: بڑی گھڑی 2: بابے

بابے اور موڈے راجپوت قوم پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی تھی لہذا خصوصی طور پر کرنال، روہتک، حصار، ہانسی یوپی اور صحرائے راجپوتانہ جیسے تقریبا تمام علاقوں میں رشتہ داریاں تھیں۔ نچلی ذات کے علاوہ تمام گاؤں میں صرف راجپوت مسلمان یا ہندو بستے تھے۔

گاؤں کے تمام باسی باہم مل جل کر رہتے تھے۔ گاؤں کا زرعی رقبہ بشمول جنگل پانچ ہزار (5000) ایکڑ تھا۔ علاقہ بارانی ہونے کی وجہ سے کچھ بندوبست انحصار کنوؤں اور چرس پر تھا۔ گاؤں کی پیداوار جو، چنا، جوار اور باجرہ تھی۔ اول الذکر پیداوار ہی خالص پیداوار تھی۔ گاؤں کے چند افراد جو لوگوں میں مشہور یا متعارف تھے۔ ان میں (1) جناب شفیع محمد خان ٹھیکیدار (2) پتی کبیر خان (3) ممتاز نمبر دار پتی خان (4) نمبر دار عباس اور (5) ان کا بیٹا شیرو۔ گاؤں کے جنگل میں ہیرن، نیل گائیں، ریچھ اور شیر کے علاوہ چھوٹے بڑے جانور پائے جاتے تھے۔ گاؤں میں کوئی خاص دستکاری نہیں تھی۔ خواتین صرف چرخہ استعمال کرتی تھیں اور اپنی گھریلو ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔

گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ برابر والے گاؤں کھیڑی میں پرائمری سکول اور دوسرے گاؤں کے کنوالی میں مڈل اور ہائی سکول تھے۔ دہلی سے پہلے کوئی کالج نہیں تھا، نزدیک ترین دہلی میں ہی تھا۔

عبدالغنی ولد حافظ شفیع محمد خان ٹھیکیدار کے چچازاد بھائی اور اللہ بخش صاحب ٹھیکیدار کے بیٹے محمد علی خان ایڈووکیٹ، جنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تھی اور حیدرآباد دکن میں اتحاد بین المسلمین کے لیڈروں میں سے تھے اور جناب رشید ترابی صاحب مشہور شیعہ عالم دین رشید ترابی کے ہم جماعت اور سید قاسم رضوی کے ہم عصر نواب بہادر جنگ کے ایک ادنی سپاہی تھے۔ جناب ممتاز خان ولد عمدہ خان پتی کبیر خان اور نمبر دار عباس صاحب اور بابا امام الدین ہی سفید پوش اور معروف افراد تھے۔

1946-1947ء میں کوئی معروف سول یا آرمی آفیسر نہیں تھا۔ گاؤں میں صرف ایک ہی مسجد تھی جو اس دور کے حساب سے نہایت خوبصورت تھی۔ گاؤں میں حافظ شفیع محمد مدخان ہی مشہور تھے مگر ان کی وجہ شہرت ان کا پیشہ ٹھیکیداری ہی تھا۔ گاؤں کے لوگ اہل سنت حنفی تھے۔ سب سیدھے سادے لوگ کسی قسم کی فرقہ پرستی میں ملوث نہیں تھے۔ گاؤں کے تمام لوگ ہر کلمہ گو کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ پگڑی اور ٹوپی کے بغیر کوئی مسلمان شخص گاؤں میں نہیں گھومتا تھا۔ اسی طرح گھوڑا اور اونٹ پر سوار شخص بھی نہیں گھومتا تھا۔ گاؤں کی عورتیں پردے کے لئے چادر استعمال کرتی تھی یا دوپٹے کا لمبا سا گھونگھٹ۔ شادی شدہ راجپوتی رسم و رواج خصوصا رنگڑی رسم و رواج کے ہوتے تھے۔ لوگ گاؤں میں یا اپنے رشتے داروں میں رشتے ناطے نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی گوتھ یا ذات برادری میں رشتہ داری قابل ترجیح تھی۔

گاؤں کے بوڑھے افراد پچیسی کھیلتے تھے اور جوان لاٹھی چلانا۔ گتکا، گھڑ سواری، نیزہ بازی، گولہ پھینکنا اور اونٹوں کی دوڑ کے شوقین تھے۔ لوگ سوانگ (سٹیج ڈراموں) میں ہیر رانجھا کو پسند کرتے تھے اور قباچے کی سارنگی پسند کرتے تھے۔

گاؤں میں چند کنویں مشہور تھے۔ جن میں باغ والا کنواں، جامن والا کنواں اور دھولیادر گو والا کنواں لوگ اپنے لئے پانی خود کنواں سے حاصل کرتے تھے یا پھر سقہ (بہشتی) یہ کام کرتے تھے۔ گاؤں میں ماجن والا جوہڑ مشہور تھا۔ گاؤں میں پکے یعنی پختہ مکانات اور کچے مکانات تھے۔ گلیاں کچی تھیں۔ دو منزلہ مکانات عرف عام میں حویلی کہلاتی تھی۔

دوسرے گاؤں کے ہندو اور سکھوں نے حملہ کیا جس میں ہیر اور جاٹ شامل تھے۔ بلوائی گاؤں کو لوٹ نہ سکے۔ ہندو آرمی نے مسلمانوں سے گاؤں خالی کروا لیا۔ زبردستی مسلمانوں کو دربدر کر دیا گیا۔ گاؤں والے ناہڑ کے کیمپ پہنچے۔ اس کے بعد نگانے کے کیمپ میں چلے گئے وہاں سے بھوانی اسٹیشن ریل کے سفر کے لیے چلے گئے۔ اس طرح اس "فاضل کا بنگلے "تک کا پیدل سفر کر کے پہلا پڑاؤ ساہیوال (منٹگمری) کیمپ میں آیا۔ اس کے بعد لوگوں نے اپنی مرضی اور سہولت اور ضرورت کے مطابق ملکہ ہنس، پاکپتن، بورے والا، کبیر والا، ملتان، ضلع اوکاڑہ اور چک A-4 میں رہائش اختیار کی یعنی خود کو آباد کیا اور آزاد وطن میں اپنی زندگی کا آغاز کیا۔

قیام پاکستان سے قبل محمد علی خان ایڈووکیٹ ولد اللہ بخش حیدر آباد دکن کی سولہ رکنی شوری جس میں آٹھ عوامی منتخب نمائندے تھے جس میں ضلع نظام آباد کی نمائندگی کرتے تھے۔ جنہیں ممبئ ایئرپورٹ پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قائد اعظم محمد علی جناح صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اپنے خاندان کا شجرہ نسب بزرگوں کے تعاون سے بڑی کاوش کے بعد مرتب کیا اور اپنے عزیزوں کو مہیا کیا۔

رانا توفیق احمد خان ولد کنور ولی محمد خان مرحوم، پہلا طویل قیام لانڈھی D-4 کراچی، 1957ء تا 2002ء، اسکے بعد چار سال ڈیفنس ویو 2002ء تا 2006ء، اس کے بعد المسلم سوسائٹی صفورا 2006ء تا 2016ء اور اب مکان نمبر C-159 بلاک 1 گلستان جوہر کراچی 2016 تا حال۔

فون نمبر: 021-34166657

موبائل نمبر 0308-2406132

حالات وواقعات (قبل وبعد ہجرت)

کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو ضبط تحریر کروں صرف ہمت کرنے کی بات تھی، دوسری یہ ہے کہ کہاں سے ابتدا کی جائے۔ مجھے میری امی جان نے بتایا تھا کہ میں 27 رمضان المبارک کی سحری کے وقت پیدا ہوا تھا، عیسوی سال کا صحیح تعین نہ کر سکیں، میرے حساب سے 1943,1942 یا 1944 کا ماہ رمضان شریف تھا، بہر حال ریکارڈ میری تاریخ پیدائش 22 اگست 1944 ہیں۔

دادا حافظ شفیع محمد خان اور پر دادا عبدالغنی خان موضع نانگل تحصیل ناہڑ (ریاست دوجانہ ضلع روہتک) سابقہ مشرقی پنجاب اور موجودہ ہریانہ کے باسی تھے۔ دادا مرحوم نے 14 سال کی عمر میں ریاست حیدر آباد دکن کا رخ کیا۔ جہاں دادا صاحب کے ماموں جناب حافظ اصغر علی خان صاحب قیام پذیر تھے اور ٹھیکیداری کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا۔ شہر نظام آباد بعد جو کہ حیدر آباد دکن کا اوسط شہر تھا۔ ضلع کا درجہ رکھتا تھا، اس کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔

گاؤں میں اتنی زمین نہیں تھی کہ خوشحالی کی زندگی گزاری جاسکے۔ ایک سال اپنے ماموں کے زیر تربیت رہنے کے بعد ماموں کے حکم کے مطابق ٹھیکیداری شروع کر دی۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے چند ہی سالوں میں کافی ترقی کر لی اور حافظ شفیع محمد خان کا بڑا ٹھیکے داروں میں شمار ہونے لگا۔ ٹھیکدار بننے میں دادا صاحب نے بڑی محنت کی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر اور دریا گوداوری کو ٹوکروں پر بیٹھ کر پار کر کے شب و روز محنت کر کے مقام حاصل کی۔

دادا مرحوم اپنی آمدنی کا حصہ اپنے رشتے داروں اور گاؤں والوں پر خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے کوئی لمبی چوڑی جائیدادیں نہیں بتائی۔ ہندو پاک دستور یعنی کلچر کے مطابق خاندان یا گاؤں کی زمین گاؤں والوں کے پاس رہے تو انہیں وقتن فوقتن گاؤں میں کچھ زمین خریدی۔

موضع نانگل بارانی علاقے میں تھا۔ پانی اور فصل کا دارومدار باران رحمت یعنی بارش پر تھا، جس کی وجہ سے باجرہ، جو، جوار اور چنا یہاں کی فصل (پیداوار) تھی۔ زیادہ تر لوگ ہندوستان کے بڑے شہروں میں محنت مزدوری کرتے تھے یا فوج میں سپاہی ہو جاتے تھے۔ لوگ چھوٹی موٹی ملازمت ممبئی، دہلی اور اجمیر وغیرہ میں کرنا پسند کرتے تھے۔ گاؤں میں صرف پرائمری تک کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ پرائمری سے آگے دوسرے گاؤں یا شہر جانا پڑتا تھا۔ زیر زمین پانی دو سو فٹ یا اس سے زیادہ گہرائی والے کنوؤں سے حاصل کیا جاتا تھا، جو کہ ربڑ کے بکوں سے نکالا جاتا تھا بکوں یعنی ربڑ کی بڑی بڑی تھیلی یا ڈول، بیلوں کی جوڑی یا گاؤں کے 4،6 جوان مل کر پانی کنوئیں سے کھینچ کر حاصل کرتے تھے۔

مختصر ایہ کہ مرحوم دادا حافظ شفیع محمد خان نے اپنی عملی زندگی کا آغاز 14 برس کی عمر سے کیا۔ تعلیم کی کمی کا احساس تھا، جس کی وجہ سے اپنے عزیزوں رشتے داروں میں زیر تعلیم طلباء کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کو تعلیم مکمل کرنے میں مدد دیتے تھے۔ حیدر آباد دکن نظام آباد شہر سے تقریبا 40 میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا شہر "نرمل" جو اپنی ہنڈی کرافٹ کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک بڑا قطعہ اراضی شہر سے منسلک لب سڑک جس کا رقبہ میری دانست میں 25 مربع ایکڑ سے کم نہیں تھا، جس روڈ کی جانب کا حصہ جو آجکل فرنٹ کہلاتا ہے، کالے پتھر کی ایک منزلہ عمارت تعمیر کروائی۔ عمارت کی پلنتھ تقریبا 5 تا 4 فٹ تھی اور کمروں کی اونچائی 15 تا 16 فٹ تھی۔ عمارت کے بائیں حصے میں مین دروازے سے قریب کنواں تھا (جسے حیدر آبادی باولی کہتے تھے)۔

حیدر آباد دکن مسلمانوں کی آبادی کا 8% فیصد سے 12% فیصد تھا تا باقی ہندو آبادی تھی۔

1940 کے دور میں مزدور کی اجرت بہت کم تھی۔ عورت اور مرد دونوں مزدوری کرتے تھے۔ عورت کو 50 پیسے اور مرد کو ایک روپیہ مزدوری ملتی تھی۔ عام آدمی جوار کی روٹی کھاتا تھا، دوسرے نمبر پر چاول کا استعمال ہوتا تھا، اچھے خاصے سفید پوش بھی گندم کی روٹی بہت کم کھاتے تھے۔ اللہ تعالی کا نظام تھا کہ دکن میں چار ماہ مسلسل بارش ہوتی تھی اور بارش کے پانی کو کچے پکے ڈیموں اور تالابوں میں جمع کر کے سالوں استعمال کیا جاتا تھا، ساتھ ہی ساتھ زیر زمین بھی استعمال ہوتا تھا۔

1953ء میں پاکستان بننے سے 6 سال پہلے تک سعودی انڈیا اور خاص کر حیدر آباد دکن میں روزگار کے لئے آتے تھے۔ حیدر آباد دکن کے حکمران میر عثمان علی خان سعودیوں کی بڑی مدد کرتے تھے۔ حیدر آباد دکن میں سعودیوں کو چاوش کہتے تھے۔ میر عثمان علی زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ اور غیر ہنر مند سعودیوں کو چوکیداری کی نوکری دیتے تھے اگر نوکری نہیں ملتی تو ان کو ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا، میری معلومات کے اس دور میں ماہانہ وظیفہ پینشن صرف 7 ہزار روپے ماہانہ تھی۔ بہر حال ریاست حیدر آباد دکن ایک خوشحال ریاست تھی۔ شمالی ہندوستان، یوپی، پنجاب اور سی پی برادری کے لوگ جس میں موجودہ ہریانہ بھی شامل ہیں پڑھے لکھے لوگ ملازمت اور دیگر لوگ محنت مزدوری اور کاروبار کے لیے آتے تھے سرکاری ملازمتوں میں بھی شمالی ہندوستان کے لوگ کافی تعداد میں تھے۔

تقسیم ہند سے تقریبا چالیس سال پہلے دادا صاحب مشرقی پنجاب سے دکن آئے تھے اور تقسیم ہند سے قبل نالمٹ ٹھیکیدار تھے۔ پاکستان کے قیام کے ایک سال بعد حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے روز یعنی 11 ستمبر 1948 کو بھارت نے حملہ کر کے حیدر آباد دکن پر قبضہ کر لیا۔ جسے حیدر آباد لوگ پولیس ایکشن کہتے ہیں۔ زوال حیدر آباد کے بعد حیدر آباد دکن میں مسلمانوں کا زوال شروع ہوا کیونکہ مقامی آبادی میں 88 فیصد تعداد ہندوؤں کی تھی۔ ہندو آبادی نے ہر سطح اور ہر جگہ اپنا قبضہ اور تسلط قائم کر لیا۔ مسلمانوں کے لیے ملازمتوں کے دروازے بند ہو گئے۔ اور کاروبار پر شرنارتھیوں یعنی پاکستان سے باہر جانے والے ہندوؤں کا قبضہ اور تسلط ہو گی۔

تقسیم ہند کے وقت دادا صاحب کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سب شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔

بیٹی مریم کی پہلی شادی صدیق ولد اسحاق سے ہوئی تھی۔ جلد ہی صدیق صاحب کا صاحب کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد بڑی بیٹی صدیق کے بھائی غلام قادر کے نکاح میں چلی گئی۔

صدیق صاحب گھر داماد تھے۔ لہذا غلام قادر صاحب بھی گھر داماد ہو گئے۔ دوسری بیٹی نور جہاں کی شادی بھی اپنے محسن ماموں حافظ اصغر علی خان کے بیٹے حافظ نیاز محمد خان صاحب سے کر دی۔ حافظ نیاز محمد صاحب کی پہلی منکوحہ انتقال فرما چکی تھی۔ بڑے داماد غلام قادر صاحب کی دس اولادیں تھیں۔ چار بیٹے چھ بیٹیاں، جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی فوت ہو گئے ہیں، صاحب اولاد تھے۔

دوسرے داماد حافظ نیاز محمد خان کی صرف تین بیٹیاں تھیں خورشید، طاہرہ اور قمر تینوں فوت ہو چکی ہیں اور ان کی اولاد کچھ پاکستان اور کچھ لندن میں، بڑی بیٹی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ تیسری بیٹی انوری عرف (انی) حیات ہیں اور پھوپھا مجید خان صاحب انتقال فرما چکے ہیں۔ ہماری تیسری بڑی پھوپھی اپنے گھر کی تھیں، ان کی چھ اولادیں ہیں۔ دو بیٹے اور چار بیٹیاں۔

دادا صاحب کی نرینہ اولاد میں دو بیٹے تھے کنور ولی محمد خان اور محمد بشیر تھے۔ دادا صاحب کی دلی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر نظام آباد میں دلوانے کی کوشش کی، جب انہوں نے توجہ نہیں دی تو مجبور ہو کر ریاست کے صدر مقام کیپٹل حیدر آباد شہر میں بورڈنگ اسکول میں جو ریاست کے بہترین اسکولوں میں شامل ہوتے تھے داخل کروایا، لیکن نتیجہ صفر رہا۔ بورڈنگ اسکول میں جا کر اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے جاگیر داروں اور نوابوں کی اولاد کے مشاغل اپنا لیے۔ چاچا صاحب تو صاف انکار کر دیا کہ میں نہیں پڑھونگا، لیکن والد صاحب نے کچھ وقت گزارا۔ فائدے کے بجائے نقصان ہوا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اولاد دست بازو بننے کے بجائے بوجھ بن گئی۔ والدہ صاحبہ یعنی اماں جان کے والد صاحب بھی ٹھیکیدار تھے اور دادا صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔ بو علی بخش، اللہ بخش اور جان محمد پر دادا عبدالغنی کے چچازاد بھائی تھے۔ والدہ صاحبہ اللہ بخش صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اپنے سسر حافظ شفیع محمد خان صاحب بھائی مخاطب کرتی تھیں۔ ہماری نانی "طوفن" ہماری دادی کی حقیقی بہن تھیں یعنی والدہ صاحبہ کی خالہ۔ ہندوستان پاکستان میں خالہ کو موسی کہتے ہیں اور خالہ زاد بھائی کو مشیر کہتے ہیں۔ اسی طرح والد صاحب والدہ صاحبہ کے مشیر بھائی تھے کیونکہ ان کی نانی اور دادی صاحبہ دونوں کا تعلق بلیالی سے تھا۔ موضع بلیالی تحصیل ریواڑی تھی اور ضلع گڑگاؤں میں واقع تھا۔ یہ تو تھی ابتدائی معلومات اپنے خاندان کے بارے میں۔

11 ستمبر 1948 بروز وفات قائد اعظم محمد علی جناح (گورنر جنرل پاکستان اور بانی پاکستان) حیدر آباد دکن کا سقوط ہو گیا یعنی انڈیا نے حیدر آباد دکن پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ سقوط دکن کے بعد والد صاحب کا نظام آباد اور نرمل میں رہنا مشکل ہو گیا کیونکہ والد صاحب کا اتحاد المسلمین سے تعلق تھا۔ اور ٹھیکیداری میں لوگوں سے مار پیٹ اور ان بن کی وجہ سے ہندوؤں سے دشمنی ہو گی۔ لہذا دادا صاحب نے والد صاحب کو پاکستان جانے کا مشورہ دیا۔ پندرہ ماہ تک والد صاحب گھر روپوش رہے اور بڑی تگ و دو بعد دادا صاحب نے براستہ ممبئی بحری جہاز کے پرمٹ بنوا کر پاکستان روانہ کر دیا۔ ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد 'میں 'توفیق احمد، بھائی رفیق احمد، اور بہن ساجدہ عرف (پتلی) اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ بحری سفر کے بعد کراچی پہنچے۔ کراچی میں اس وقت ہمارا کوئی عزیز نہیں تھا۔ والد صاحب نے ہوٹل میں قیام کیا، ہوٹل کا نام کراچی ہوٹل تھا۔ یہ بولٹن مارکیٹ کی لب سڑک پر واقع تھا۔ والد صاحب کو کچھ کچی پکی معلومات تھی۔ ہمارے ایک دور کے جانے والے صدیق صاحب گاؤں کے نام کی مناسبت سے صدیق بھاٹلیا کہلاتے تھے۔ کراچی میں جوتوں کی دکان ہے۔ بولٹن اور برنس روڈ ہی کاروباری مرکز تھا، دو تین دن کی تگ و دو کے بعد تلاش کر لیا اور صدیق بھاٹلیہ صاحب سے معلوم ہوا کہ والدہ صاحب کے حقیقی چچازاد بھائی سلیمان خان صاحب بھی کراچی میں ہیں کیونکہ اس دوران لوگ خاموشی سے ہجرت کرتے تھے۔ ماموں سلیمان خان صاحب ہمیں ہوٹل سے اپنے گھر حیدر آباد کالونی لے گئے۔ ہم سلیمان ماموں کے گھر دو ہفتے مہمان رہے۔ اس کے بعد قریب ہی ایک مکان کرائے پر لے لیا، غالباوہ مکان بھی ماموں صاحب کی ملکیت ہی تھا۔ جو کہ موجودہ بہادر یار جنگ کے بالکل عقب میں تھا۔ دادا صاحب کے حکم پر ہم نوابشاہ چلے گئے۔ والد صاحب نے محکمہ سیٹلمنٹ سے سے ایک مکان مارکیٹ روڈ نوابشاہ پر الاٹ کروالیا تھا۔ مکان ڈبل سٹوری اور لب سڑک مارکیٹ کے درمیان تھا۔ والد صاحب اور پھوپھا عبدالمجید خان صاحب کو بھی ایک مکان موچی گلی موہنی بازار میں الاٹ کروالیا اس مکان کا ایک دروازہ موچی گلی میں اور دوسرا دروازہ موہنی بازار کی طرف نکلتا تھا۔ جہاں نگلے والے رہتے تھے اور زمانے سیکنڈ لیفٹیننٹ اور "1965 " کے "بریگیڈیئر بشیر صاحب" نگلے والوں کا مکان تھا۔ پھوپھا صاحب کا مکان بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ والد صاحب نواب شاہ شہر میں مسلم لیگ کے نائب صدر تھے اور ایک مخلص کارکن بھی تھے، مہاجرین کی فلاح و بہبود اور آبادکاری کے لئے بہت کام کیا اور کسی قسم کا ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ تھوڑے عرصے بعد مسلم لیگ والوں کو دفتر کی ضرورت پڑی، والد صاحب نے مکان کے محل وقوع کی مناسبت سے اپنے مکان کو مسلم لیگ کے دفتر کے لیے دے دیا۔ اس کے بدلے میں محلہ منوآباد جہاں مہاجرین کی اکثریت رہتی اور تمام لوگ اردو بولنے والے رہتے تھے۔ ایک مکان لے لیا۔ مکان کے اطراف تین طرف راجستانی (باگڑی) رہتے تھے اور ایک طرف اجمیر شریف کا شہری ماحول، پڑھی لکھی فیملیاں رہتی تھی۔ ہمارے سامنے

انعام اللہ صاحب رہتے تھے،ان کے ایک بھائی کسی سرکاری محکمے میں کام کرتے تھے اور چھوٹے بھائی وکالت کر رہے تھے، ابھی ان کی وکالت کی ابتدا تھی۔انعام اللہ خان صاحب بھی ایک دیرینہ کارکن تھے۔والد صاحب اور انعام اللہ خان صاحب مہاجرین کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں۔اگر چاہتے تو بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔والد صاحب کو کمانے کھانے کی فکر تو تھی ہی نہیں کیونکہ حیدر آباد دکن سے دادا صاحب گزر بسر کے لیے ماہانہ بنیاد پر پیسے بھیجتے رہتے تھے۔

ہمارے والد صاحب نے میونسپلٹی میں ٹھیکیداری کی مگر خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔گھریلو اخراجات کے لیے رقم دادا صاحب ہندوستان یعنی حیدر آباد دکن سے آنے والوں کے ذریعے یا 'ہنڈی' کے ذریعے پانچ سے دس ہزار بھیجتے تھے جو کہ تین سے چار ماہ تک کے لیے کافی ہوتے تھے۔کچھ عرصے بعد لوگوں نے درمیان میں گڑبڑ شروع کر دی۔جس کی وجہ سے پریشانی لاحق ہونے لگی۔وقت کے ساتھ ساتھ دادا صاحب کے مالی حالات خراب ہونے لگے۔حیدر آباد دکن آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا،ایک وقت ایسا آیا کہ بالکل ختم ہو گیا۔گھر کے حالات دگرگوں ہو گئے۔اس دوران والد صاحب کے سگے پھوپھا جن کا کوئی نہیں تھا وہ ملکہ ہنس نزد پاکپتن میں اپنے بھتیجے جس کا نام ارشاد تھا ان سے ناراض ہو کر نواب شاہ ہمارے پاس آ گئے اور گھر کے فرد بن گئے۔گھر کے حالات دیکھ کر والدہ صاحبہ کو مشورہ دیا کہ تم کسی طرح ہزار-پانچ سو بندوبست کر لو۔سرہاری میں میرے رشتہ دار رہتے ہیں۔وہاں سے 2-3 بھینسیں خرید کر لے آؤں گا۔ والدہ صاحبہ نے کہا ہم نے کبھی بھینس نہیں پالی،انڈیا میں تو یہ سب کام نوکر چاکر (ملازم) کرتے تھے۔انہوں نے کہا مجھ سے جتنا کام ہو سکے گا کروں گا اور دودھ دوہنا میرا کام ہے تم اور بچے میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔

محترم پھوپھا صاحب کی کاوشوں سے گھریلو پریشانیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی،دادا صاحب کی مالی معاونت کا انحصار بالکل ختم نہیں ہوا۔ کبھی کبھی (ایڈ) امداد آ جاتی تھی۔یہ تھے پاکستان آنے کے حالات و واقعات۔

میرا اور میرے بڑے بھائی کا تعلیمی سلسلہ نظام آباد (دکن) کے پرائمری اسکول سے شروع ہوا۔ایک سرکاری اسکول تھا۔بچے ٹاٹ پٹی پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔والدہ صاحبہ کے چچازاد بھائیوں کی اولادیں بھی سرکاری اسکول میں پڑھتی تھی۔نظام آباد میں انگلش میڈیم سکول جس میں کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے پڑھتے تھے۔نظام آباد میں ماموں محمد علی خان صاحب کے بچے ماڈل اسکول میں پڑھتے تھے اور اماں جان کے چچازاد بھائیوں کے ساتھ ماڈل انگلش اسکول میں پڑھنے جانے لگے۔ماموں محمد علی خان نے دادا صاحب سے اصرار کر کے ماڈل انگلش اسکول میں داخل کروایا۔میں اور میری چھوٹی بہن ساجدہ (عرف تپلی) ماڈل انگلش پرائمری سکول کے طالب علم بن گئے۔

اس طرح زندگی کا پہلا اسکول جہاں باقاعدہ یونیفارم تھی۔لڑکے مہرون کلر کی شیروانی،سیاہ جوتے،سفید کرتا پاجامہ اور سر پر ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔لڑکیاں نیلے رنگ کی فراک (قمیض) اور سفید شلوار اور سیاہ جوتے بطور یونیفارم پہنتی تھیں۔ہندو لڑکیاں نیلی فراک پہنتی تھیں۔یہ 1948 کا ابتدائی دور تھا۔یہ میرے اور ساجدہ کے تعلیمی کیریئر کا آغاز تھا۔بڑے بھائی صاحب دادا کی محبت میں نرمل اور نظام آباد کے درمیان فٹبال بنے ہوئے تھے۔کبھی نرمل میں ہوتے اور کبھی نظام آباد،بہر حال ان کا بھی تیسری جماعت میں داخلہ ہو گیا۔ابھی دو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ سقوط حیدر آباد ہو گیا یعنی حیدر آباد دکن پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا۔جس روز بھارتی افواج ٹینکوں پر سوار ہو کر حملہ آور ہوئیں،ہم اسکول میں تھے۔حیدر آباد دکن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی،لہذا ہندوؤں نے بھارتی فوج کو خوش آمدید کہا۔اور جلوس نکالے۔10 بجے دن کے قریب ایک جلوس نے ہمارے اسکول پر دھاوا بول دیا۔اسکول کی چھٹی کی گھنٹی بجادی اور 'جیئے ہند' کے نعرے لگاتے ہوئے اسکول میں داخل ہو گئے ہیں۔اسکول کے تمام طلباء تتر بتر ہو گئے اور اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔کسی کو ایک دوسرے کی خبر نہیں

تھی میں اور ساجدہ اسکول سے باہر نکل گئے۔ ہماری کلاس کی ایک 'ہندو لڑکی' تھی جو ہمیں اپنے گھر کی طرف لے گئی۔ راستے میں ہندو بلوائیوں نے ہمیں گھیر لیا اور میرے سر پر ایک زوردار ہاتھ مارا اور میرے سر سے ترکی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ بلوائی نعرے لگا رہے تھے۔ ترکی ٹوپی نہیں چلے گی۔ گاندھی ٹوپی چلے گی۔ بلوائی اس سے پہلے ہماری پٹائی کرتے، ہمارے ساتھ والی ہندو لڑکی کا والد آگیا اور بلوائیوں کے نرغے سے ہمیں نکال کر اپنے گھر کی طرف لے گیا اور ہم سے کہا کہ اس طرف سے نہیں جاؤ گے بلکہ سرکاری ہسپتال کے درمیان سے جاؤ گے، آگے مسلم اکثریتی محلہ ہے تم خیریت سے گھر پہنچ جاؤ گے۔ ہم بچتے بچاتے اپنے محلہ لائن گلی پہنچ گئے۔ ہم سے بڑی عمر والے بچے پہلے ہی گھر پہنچ چکے تھے۔ اس طرح ہماری اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حالات نارمل ہونے کے بعد ہم اسکول گئے یا نہیں، یہ مجھے یاد نہیں۔ ستمبر 1948 سے جولائی 1949 تک کا عرصہ نظام آباد میں رہے اور پھر پاکستان آگئے۔

پاکستان میں اسلامیہ ہائی اسکول اسٹیشن روڈ نوابشاہ میں پہلی جماعت میں داخلہ لیا۔ اسکول میں اول تا چہارم طلباء ٹاٹ پٹری پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ مارکیٹ روڈ سے ہم منوآباد شفٹ ہو چکے تھے۔ شہادت لیاقت علی خان کے ہونے تک ہم منوآباد ہی میں مقیم تھے۔ میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ ہماری جماعت کے ٹیچر اردو کے پیریڈ میں اخبار پڑھوایا کرتے ہیں۔ تعلیمی سال مارچ میں ختم ہو کر اپریل میں شروع ہوتا تھا۔ مارچ 1953ء کو ہمارے ماموں کے گھر بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اشفاق احمد (عرف نواب) تھا۔ اس وقت پھوپھی صاحبہ پرانے نواب شاہ میں رہائش پذیر تھیں۔ والدہ صاحبہ بلاناغہ پھوپھی صاحبہ کی مزاج پرسی کے لیے پرانے نوابشاہ روزانہ ایک چکر ضرور لگاتی تھی۔ میں اور بہن جو کے والدہ صاحبہ کے ساتھ ہمراہ ہوتے تھے۔۔ 1951 سے 1956 تک کا عرصہ منوآباد میں گزارا۔ 1951 اسلامیہ سکول سے گورنمنٹ پرائمری اسکول غریب آباد میں داخلہ لے لیا اس کے بعد جماعت اسلامی والوں نے ایک مدرسہ (نیا مدرسے کے نام سے) کھولا تھا۔ جناب مصایب علی صاحب اور جناب طٰہٰ یاسین صاحب معروف استاد تھے۔ جن کی زیر تربیت پانچویں جماعت پاس کی اور اس کے بعد موہنی بازار میں قائم اسکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر جناب اللہ ڈنو صاحب تھے۔ ایک اور صاحب ہسٹری کے ٹیچر سر محمد قاسم صاحب ہمارے کلاس ٹیچر تھے، ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ تاریخ کے حافظ تھے۔ اور ششم تا دہم انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ جناب مصایب علی صاحب جماعت اسلامی کے امیر بنے اور بیٹا مجاہد معائب علی سیاست میں آگیا۔ بہر حال چوتھی اور پانچویں جماعت "نیا مدرسے" سے جس کے بعد اسلامیہ ہائی سکول میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے مسلم ہائی سکول کچہری روڈ محلہ موہنی بازار میں داخلہ لے لیا۔ اس اسکول میں بہت سے راجپوت رانگڑ لڑکے پڑھتے تھے اور چوہدری عباس صاحب کا بڑا بیٹا حنیف راجپوت میرے بڑے بھائی صاحب کا ہم جماعت اور چھوٹا بیٹا شریف راجپوت میرا ہم جماعت تھا۔ حنیف راجپوت نے ایک عرصہ لندن میں گزارا۔ بھائی بھی 1962 میں لندن چلے گئے تھے وہاں بھی ان کی دوستی قائم رہی۔ چند مہینوں کے بعد موسم گرما کی چھٹیاں ہو گئی۔ والدہ صاحبہ نے حیدرآباد دکن جانے کا پروگرام بنالیا والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب 1955 کے شروع میں انڈیا کا دورہ کر چکے تھے۔ لہذا 'میں' نے اماں جان اور نیلی نے 1955 کی جون جولائی میں پروگرام بنایا جو کہ ستمبر 1955 میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور ہم 19 ستمبر 1955 میں دکن پہنچے۔ ہم پانی کے جہاز سے براستہ ممبئی سے نظام آباد حیدرآباد پہنچے۔ 1955 کے زمانے میں انڈیا پاکستان میں کرکٹ کے کھیل کا بڑا چرچا اور شوق تھا۔ میں نے انڈیا جاتے وقت کٹ بیگ تیار کیا اور انڈیا لے گیا۔ ممبئی میں کسٹم والے نے پریشان کیا مگر میری ضد کرنے پر کسٹم والوں نے اجازت دے دی۔ ویسے ہمارے پاس کوئی خاص سامان تو تھا ہی نہیں۔ ممبئی سے براستہ شہر حیدرآباد دکن جاتے ہوئے ہم کو اپنے جہاز میں ایک حیدرآبادی انتہائی شریف فیملی مل گئی تھی۔ انہوں نے بڑا تعاون کیا ہمیں وہ اپنے گھر میں لے گئے اور ہمیں لنچ کروایا اور خود جا کر شام 4 بجے نظام آباد جانے والی گاڑی میں سوار کروایا اور ہمارے ساتھ محبت اور خلوص سے پیش آئے اور والدہ صاحبہ کا بہت ادب احترام کیا۔ مغرب سے پہلے نظام آباد پہنچ گئے۔ جانا پہچانا شہر تھا، ویسے بھی دادا مشہور شخصیت تھے۔ گلی محلہ گتہ داروں کا کہلاتا تھا (یعنی ٹھیکیداروں کی گلی) بہر حال بڑے آرام سے گھر پہنچ گئے۔

دادا صاحب بہت خوش ہوئے۔ وہاں عزیزوں کی فیملی بھی تھیں۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ بڑے ماموں محمد علی خان صاحب کا گھر خریدنے والے ہندو شرنارتھی تھے۔ جن کا نام تھا'ایل داس متھراس'اور ان کے تین بیٹے تھے۔ لالہ بھائی، راجو اور شنکر، ان سے میری دوستی ہوگئی۔ ہر وقت کراچی کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ مسلمان رشتہ داروں اور عزیزوں سے تو دوستی تھی ہی۔ ہمارے پھوپھی زاد بھائی جمیل بھائی اور ڈاکٹر اقبال صاحب سے لالہ بھائی کی دوستی تھی۔ ہمارے گھر کے پیچھے ایک خالی پلاٹ تھا اس کے بعد روڈ، روڈ کراس کرنے کے بعد کھیلوں کے لیے ایک بہت بڑا میدان تھا۔ حیدر آباد میں فٹ بال والی بال اور بیڈ منٹن زیادہ کھیلی جاتی تھی کرکٹ کا نیا نیا شوق تھا۔ مسلم لڑکے کرکٹ کھیلتے گراؤنڈ کے سامنے۔ کھلی جگہ تھی۔ قلعے کی طرف کچھ سکھ لڑکے مارکیٹ سے آتے جاتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر ہماری پچ کو کراس کرتے تھے، منع کرنے پر دھونس دکھاتے تھے۔ ایک دن میں بیٹنگ کر رہا تھا کہ ایک سکھ لڑکے نے 'پچ' کراس کرنے کی شرارت کی۔ میں نے منع کیا تو کہا کیا کر لوگے پاکستانی! میں نے کہا اگر تم نہیں مانوگے میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔ دوسرے لمحے اس نے قدم بڑھایا اور میں نے بلا گھمایا جو اس کے سر پر لگا۔ سکھ لڑکے کے سر سے خون بہنے لگا ہم نے کھیل فوری ختم کر دیا۔ کھلاڑی میدان میں جمع ہوگئے اور پچ پر بیٹھ گئے۔ سکھ لڑکا اپنے گھر چلا گیا۔ راجو نے مجھے کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ گھر نہیں جانا، اپنے جاننے والوں کی طرف چلے جاؤ اور میں نے فوراً سبزی منڈی کا رخ کیا اور ایک خالی سبزی کی دکان میں نیچے تہہ خانے جا کر چھپ گیا۔ روشن دان سے کھیل کا میدان اور گھر وغیرہ صاف نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر میں زخمی سکھ لڑکا ایک جلوس کی شکل میں آگیا اور کہا کہاں ہے وہ 'پاکستانی'۔ لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اور اس کے ساتھی بضد تھے لڑکے کا گھر بتاؤ۔ مجمعے میں سے کسی نے اشارے سے گھر کی نشاندہی کی اور وہ جلوس کی شکل میں گھر پہنچ گئے، اتنے میں راجو کے بڑے بھائی لالہ بھائی گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے جلوس کے شرکاء کو سمجھا کر منتشر کر دیا اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔ گھر والے بہت پریشان تھے۔ ہندو مسلم فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن لالہ بھائی 'معاملہ 'کو رفع دفع کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہفتے دس دن تک کرکٹ کا شوق ختم کرنا پڑا اور اسی دوران ہمارا ویزا بھی ختم ہو گیا۔ والدہ صاحبہ نے کراچی پہنچ کر نوابشاہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا، کیونکہ بھینسوں نے دودھ دینا ختم کر دیا تھا، اس لیے نئی بھینسیں خریدنا پڑتیں۔ نواب شاہ میں وسائل صفر ہو گئے تھے۔ ہم لوگ فاطمہ جناح کالونی میں گرین روڈ اسکول کے سامنے سلمان ماموں کے ہاں مہمان ہوگئے اور کراچی میں مستقل قیام کی جدوجہد شروع کر دی۔ (والدہ صاحبہ بہت باہمت خاتون تھیں)۔

حیدر آباد کالونی میں موجودہ کشمیر روڈ پر موجود 'شاپنگ مال' کے سامنے ایک کچی آبادی 'اسلام آباد' کے نام سے تھی۔ جو کہ واٹر بورڈ کے پمپنگ اسٹیشن کی زمین پر بنی ہوئی تھی۔ وہاں پر "شبر" کے چچا شریف اور چچی چھوٹی خالہ جن کا نام محبوب بیگم تھا۔ ایک جھونپڑی میں رہتے تھے اور ساتھ ہی میں ان کا بھینسوں کا باڑا تھا۔ جھونپڑی کے ایک کمرہ چٹائیوں کا سامنے چھوٹا سا صحن وہ بھی چٹائیوں سے گھیر کر بنایا ہوا تھا۔ صحن میں ایک چٹائیوں کا کمرہ بنایا گیا۔ جس کی لمبائی 11 یا 12 فٹ تھی اور چوڑائی تقریباً ساڑھے سات یا آٹھ فٹ تھی یعنی اگر جھگی کی چوڑائی میں لیٹتے تو سر اور پیر دیواروں کو لگ جاتے تھے۔ اس جھگی میں ایک چولھا تھوڑا بہت کھانے پینے کا یعنی کچن کا سامان رکھ لیا گیا تھا۔ کھانا پکانے سے سے پہلے فرشی بستر کا سمیٹنا ضروری تھا۔ ایک کونے میں مٹکا رکھا رہتا تھا۔ باہر پانی کی ایک چھوٹی سی پانی کی ٹینکی رکھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں خواتین کے لیے واش روم تھا۔ مرد حضرات گورنمنٹ کے پبلک ٹوائلٹ جو روڈ کے کنارے لائن سے بنے ہوئے تھے، جس کے ساتھ خواتین کے لئے بھی علیحدہ ٹوائلٹ بنے ہوئے تھے، جو تمام آبادی استعمال کرتی تھی۔ نماز کے لیے مکہ مسجد حیدر آباد کالونی جاتے تھے۔ رہائش کا مسئلہ تو وقتی طور پر حل ہو گیا تھا۔ مسئلہ روزگار اور گزر بسر کے لیے آمدنی کا تھا۔ رفیق بھائی صاحب بھی نوابشاہ سے کراچی آگئے تھے۔ رفیق بھائی صاحب کو ٹی ٹی سی ٹیکنکل ٹریننگ سینٹر میں واقع "این ای ڈی" یونیورسٹی کمپلیکس میں مکینیسٹ ٹریڈ میں داخلہ مل گیا تھا۔ جہاں آٹھویں کلاس کے بعد داخلہ ملتا تھا۔

اب آگے معاشی مسائل تھے۔ میں نے ابھی داخلہ نہیں لیا تھا۔ کریمامامی نے والدہ صاحبہ کو سمجھایا، اگر توفیق مل میں کام کر سکتا ہے تو میں گودرا کیمپ میں خاتون سپر وائزر جو میری جاننے والی، ان سے کام کے لیے بات کرتی ہوں۔ والدہ صاحبہ نے بادل نخواستہ حامی بھر لی اور خاتون سپر وائزر نے، جہاں وہ کام کرتی تھی۔ لیبر میں بھرتی کروادیا۔ بوانی مل سائٹ ایریا میں مجھے بوم سیکشن میں مشین آپریٹر لگادیا۔ سیشن انچارج نے مشین آپریٹ کرنے کا کام سکھادیا اور مشین پر کھڑا کر دیا۔ مسلسل آٹھ گھنٹے کھڑے رہنے کا کام تھا۔ اس زمانے میں آنے جانے کے لیے بوانی مل کی بسیں تھی۔ آٹھ گھنٹے کی مزدوری 'ڈھائی روپے' ملتے تھے اگر اور ٹائم کریں تو اس کی مزدوری الگ سے ملتی تھی اور پندرہ دن میں مزدوری ملتی تھی۔ ایک پندرہ دن کا عرصہ سکون سے گزرا۔ دوسرے پندرہ دن بعد گودرا والے لڑکوں نے سازش شروع کر دی۔ دوسرے 15 دن کی مزدوری دیتے ہوئے ہوئے اکاؤنٹ نے کہا کہ کل سے تمہاری چھٹی۔ کسی اور مل میں جگہ تلاش کر لو۔ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے والا حساب ہو گیا۔ اس دوران میں دادا صاحب نے نے کچھ رقم بھیج دی اور تسلی دی کہ زیادہ پریشان نہیں ہونا۔ دکنی ایڈ ملنے کے بعد والدہ صاحبہ نے مجھے چھٹی جماعت کے لیے پیر الہی بخش کالونی میں یعقوب بھائی کے اسکول میں داخلہ دلوادیا۔ میں اور یعقوب بھائی ہم جماعت بن گئے ہماری جھگی یعنی ہمارے محل کے سامنے بہت بڑا میدان خالی تھا۔ جس میں مرد حضرات گرمی کے دنوں میں رات کو پلنگ میدان میں بچھا لیتے تھے۔

میری ایک ماہ کی باوانی مل کی نوکری اور چھٹی جماعت میں دوبارہ داخلے کے دوران جب سے میں نے اسکول جانا شروع کیا۔ بھائی صاحب کے " TTC" طلباء نے "DJ" اور "NED" یونیورسٹی کے ساتھیوں کے ساتھ "یوم شہداء" کے موقع پر جلوس نکالا۔ بھائی صاحب بھی جلوس میں شامل تھے۔ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے بعد فائرنگ ہوئی، بھائی صاحب کو اسی دوران آنسو گیس کا شیل لگا۔ وہ بیہوش ہو گئے۔ حیدر آباد کالونی کے طلباء جو "DJ" اور "NED" کے طالب علم تھے، پہلے ہسپتال لے گئے اور پھر گھر لے آئے۔ اس طرح ایک سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ میں نے ساتھویں "VII" جماعت پاس کر لی اور بھائی صاحب کا مکینسٹ "Mechanist" کا کورس مکمل ہو گیا۔ میں آٹھویں "VIII" جماعت میں پہنچ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک دوپہر جھگیوں میں آگ لگ گئی۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ہماری جھگی تک آنے سے پہلے آگ بجھ گئی۔ شریف بھائی مرحوم کے بھینسوں کے باڑے کو تھوڑا نقصان پہنچا۔ رفیق بھائی اور اباجان نواب شاہ سے آگے تھے کیونکہ اباجان نے ایک ہفت روزہ اردو اخبار "برق" 16 اکتوبر کو "شہید ملت خان لیاقت علی" کی پہلی برسی کے موقع پر نکالا تھا۔ جس کے 'ایڈیٹر' رفیق بھائی مرحوم اور 'اونر' اباجان تھے۔ برق اخبار میں ضلعی انتظامیہ، وڈیروں اور سیاستدانوں کے بارے میں خبریں چلنے لگیں تو وڈیرے، کمشنر اور ڈپٹی کمشنر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے "ہفت روزہ برق" کی انتظامیہ کو پریشان کرنا شروع کر دیا، لہذا والد صاحب کراچی آ گئے۔ اب کراچی کی جھگی میں گزارا کرنا مشکل ہو گیا تھا، لہذا حیدر آباد کالونی میں کرائے کے مکان کی تلاش شروع کر دی۔ اتفاق سے ایک حیدر آبادی وکیل چراغ علی صاحب: جن کی اباجان نے کلیم کی زمینوں کے حصول میں کافی مدد کی تھی اور وہ مجید پھوپھا اور والد صاحب کے اچھے دوست تھے۔ ہمارے پھوپھا مجید سے کہا اسلام آباد کی کچی آبادی میں ان کا ایک نیم پختہ کچے صحن کے ساتھ ایک مکان ہے، وہ لے لیں۔ کرایہ جو مناسب ہو اور جب ہو، دے دینا۔ اس طرح ہم تین کمروں کے مکان: جس کی چھت سیمنٹ کی چادروں کی تھی شفٹ ہو گئے۔ شریف بھائی کو بھی باڑے کی وجہ سے جھگی چھوڑنی پڑی۔ وہ بھی ان تین کمروں کے مکان کے ایک کمرے میں پارٹیشن بنا کر شفٹ ہو گئے۔ اسی دوران ظفر بھائی شبر اور ان کی والدہ "فاطمہ" بھی سکندر آباد پنجاب سے کراچی منتقل ہو گئیں۔ وکیل چراغ علی صاحب کے مکان کا چوتھا کمرہ بھی ان سے درخواست کر کے حاصل کر لیا گیا۔ اس طرح چار کمروں میں تین خاندان رہائش پذیر ہو گئے۔ سب کے بیت الخلا اپنے اپنے حصوں میں بنا دیے گئے۔ اور تھوڑا تھوڑا صحن بھی چٹائیوں کی باڑ لگا کر بنا دیا گیا۔ ہمیں ایک بڑا اور ایک چھوٹا کمرہ ملا، جس کا صحن ذرا بڑا تھا۔ اس دوران جناب عبداللطیف خان جو 'انجینئر' تھے۔ پیر الٰہی بخش کالونی پلاٹ نمبر 14 لیاری ندی کے کنارے رہتے تھے۔ وہاں ہماری پھوپھی صاحبہ جو اپنے دیور کے مکان میں رہتی تھیں ۔ ان کی ساس اور سسر سے نہیں بنتی تھی لیکن پھر بھی انی اور مجید خالو کی فیملی ہمارے کچے پکے مکان کے صحن

میں جھگی بنا کر منتقل ہو گئے۔ جب عبداللطیف خان صاحب کا ٹرانسفر "گھارو" میں فلٹر پلانٹ پر ہو گیا اور وہ K1 منصوبے کے ایکسن ہو گئے، تو وہ اپنے والدین کے ساتھ فلٹر پلانٹ گھارو کی سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے۔

یہ سلسلہ چھ سے آٹھ ماہ تک چلتا رہا۔ ہماری کچھی آبادی جس کا نام اسلام آباد تھا۔ ہمارے آس پڑوس میں زیادہ تر حیدر آبادی فیملیز تھیں اور اس کے بعد سائیڈ والے آبادی میں بریلی والے تھے۔ حیدر آبادی تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ تھے اور بریلی والی آبادی میں زیادہ تر مزدور اور دیگر ہنر مند افراد رہتے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے یعنی جھگیوں کے سامنے واٹر بورڈ کا پمپنگ اسٹیشن اور بڑا میدان تھا۔ وہاں میدان میں ہم لوگ کرکٹ کھیلتے تھے اور پتنگ اڑاتے تھے۔ میں، ظفر بھائی اور شبر پتنگ اڑا رہے تھے۔ ایک بریلی والے لڑکے نے ظفر بھائی کی پتنگ کاٹ دی، ظفر صاحب نے بریلی والے لڑکے کو برا بھلا کہا اور پٹائی کر دی۔ پھر کیا تھا۔ پندرہ بیس بریلی والے لڑکے جمع ہو گئے۔ ظفر بھائی صاحب رفو چکر ہو گئے 'شبر' بھی نو دو گیارہ ہو گیا۔ میں اور چند حیدر آبادی لڑکے مقابلہ کرتے رہے، اسی دوران ایک بریلی والے لڑکے نے میرے سر پر لاٹھی ماری، جس سے میرا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ خون دیکھ کر بریلی والے لڑکے بھی بھاگ گئے۔ چند حیدر آبادی بزرگ جمع ہو گئے اور اصرار کیا کہ پولیس میں رپورٹ کی جائے۔ نہیں تو آئندہ بریلی والے شیر ہو جائیں گے۔ مختصر ایہ کہ بریلی والوں نے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ بہر حال ظفر بھائی صاحب فساد کروا کر بھاگ گئے۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد حکومت نے مہاجرین کی آبادکاری کے پروگرام کے تحت اسلام آباد کی کچھ آبادی کو لانڈھی منتقل کرنے کا اعلان کر دیا۔

((کہانی شفٹنگ کی))

ہر ایک فیملی جن کا راشن کارڈ بنا ہوا تھا۔ ایک 80 مربع گز کا مکان؛ جس میں ایک کمرہ معہ دروازہ اور کچن، ٹوائلٹ چھت دار اور دروازے کے تھے اور 7 فٹ کی چار دیواری اور مین گیٹ پر کڑی دروازہ تھا، الاٹ کیا۔ ہم انیس سو ستاون بتاریخ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لانڈھی شفٹ ہو گے۔ محکمہ آبادکاری کے ٹرکوں میں ہمارا سامان لوڈ کر دیا گیا اور ہر گھر کا ایک فرد اپنے سامان کے ساتھ ٹرک پر سوار ہو گیا۔ مجھے اور 'شبر' کو سامان کے اوپر بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ ہم محلے والوں کے ساتھ لانڈھی پہنچ گئے۔ ہمارا کانوائے پہلے لانڈھی کے علاقے B-4 میں پہنچا، جہاں پہنچ کر ڈاکٹر افتخار عالم خاں، خالو مجید ہمارے پڑوسی سلام بھائی اور چنوں بھائی نے کہا؛ ہم اس علاقے میں نہیں رہیں گے، ہمیں کسی دوسرے علاقے میں کوارٹر دیے جائیں۔ اس افسر محکمہ آبادکاری نے کہا آپ جو دس بارہ گھرانے ہیں، یہیں رک جائیں اور ایک ٹرک پر ہم تین چار افراد چلے جائیں اور جگہ چن لیں۔ بھلے مانس کی بات لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔ لانڈھی نمبر 6 موجودہ گلشن مارکیٹ (جہاں پہلے ویران میدان تھا) کے سامنے کے علاقے میں بلاک نمبر 110-111، بلاک نمبر 108 اور بلاک نمبر 109 خالی تھے۔ ہمارے سامنے والے بلاک 109 میں سے دو خاندان سلطان پوری آباد تھے (جو پوربی) زبان بولتے تھے۔ تین بلاکوں میں ہم حیدر آبادی قیام پذیر ہو گئے۔ ہمارے لانڈی پہنچ جانے کے بعد دیگر محلے والے اور شریف بھائی بمعہ بھینسوں کے پہنچ گئے۔ بہر حال جھگی سے پکی چھت والے کوارٹر میں منتقل ہونا اچھا لگا۔ ہم تمام محلے والے ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ ضروریات زندگی کے لیے آپس میں ادھار لینا معمول تھا۔ اس میں کوئی عار اور شرمندگی محسوس نہیں کرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے یا دیگر مسائل اور پریشانی کا پوچھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر مدد بھی کرتے تھے اور شیئر (share) بھی کرتے تھے۔ ابھی والدہ صاحبہ لانڈھی تشریف نہیں لائیں تھیں۔ والدہ صاحبہ ماموں کے مکان جیل روڈ حیدر آباد کالونی سے لانڈھی پہنچ گئی۔ 1958ء سے 1960ء تک ہم روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر رہے تھے۔ یہ عرصہ سیٹلمنٹ اور کلیموں کا تھا۔ مجید خالو کلیموں کے چکر میں تھے انہیں کافی زمین اور مکان وغیرہ مل گئے۔ والد صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہر حال مجید پھوپھا صاحب کے پاس پیسے کی آوت جاوت تھی۔ ابتدائی دنوں میں حالات بڑے سخت

تھے مالی وسائل بالکل نہیں تھے۔ کچھ کرنے کی جستجو میں کچھ تجربات کیے۔ میں نے اور 'شبر' نے صبح سویرے گلیوں میں آواز لگا کر ڈبل روٹی اور پاپے فروخت کیے، جس میں مزہ نہیں آیا تو گلی گلی آواز لگا کر دودھ فروخت کیا۔ چند دن دودھ کی دکان لگا کر دودھ فروخت کیا۔ کوئی خاص خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد کاغذ کے لفافے اور ماچس کی پیکنگ کا کام بھی کیا، جس میں خواتین نے بھی تعاون کیا لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ اس تگ ودو میں ڈیڑھ سال نکل گیا۔ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد نوکری کی تلاش شروع کی مگر کراچی شہر میں نوکری نہیں ملی۔ اس وقت عبداللطیف خان صاحب ایکسن اور گھارو میں تھے۔ انہوں نے اپنے خالہ زاد بھائی عبدالباسط اور رفیق بھائی کو انکاس نامی اٹالین کمپنی جو "72 انچ کی پائپ لائن کے منصوبے پر کام کر رہی تھی، نوکری دلوادی۔ عبدالباسط بھائی میٹرک کر چکے تھے، لہذا انہیں اسٹور پر لگا دیا اور بھائی کو ورک شاپ میں فٹر لگوادیا کیوں کہ کمپنی میں مشینسٹ کی جاب نہیں تھی۔ وہاں پر انہوں نے on job جمیل استاد جو کہ آل راؤنڈ ہیوی موٹر مکینک تھے، بھائی صاحب کو کام سکھادیا۔ بھائی صاحب انکاس کمپنی کے ورکشاپ نے کام کرتے تھے اور عبدالباسط بھائی اسٹور میں کام کرتے تھے۔ اس دوران عبداللطیف خان صاحب نے والد صاحب کی دوستی اور رشتہ داری کی وجہ سے فلٹر پلانٹ کے قریب ایک افسر کا بنگلہ دلوادیا۔ جس میں ہم اور عبدالباسط بھائی آدھے آدھے حصے میں رہتے تھے۔ عبدالباسط بھائی کے بچے وغیرہ نہیں تھے، لہذا ان کو تو ایک کمرا چاہیے تھا، بقایا تمام گھر ہمارے استعمال میں تھا۔ اس دوران ہم لوگ مکمل لانڈھی شفٹ ہو گئے تھے۔

"انی" اور ہمارا راشن کارڈ بنا ہوا تھا، لہذا ہمیں ایک ایک کوارٹر الاٹ ہو گیا۔ شریف بھائی کو جھگی اور باڑے کی وجہ سے دو کوارٹر الاٹ ہوئے۔ ایک ان کے نام اور ایک ان کے ملازم گوالے کے نام + شریف بھائی کے چھوٹے بھائی اقبال صاحب پولیس والے نے جو باڑے میں رہتے تھے اور انہوں نے راشن کارڈ بنایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اقبال بھائی نے اپنے دوست نذر محمد جو کہ راجپوت تھے جن کی بیوی کا نام وسیلہ تھا ان کا بھی راشن کارڈ بنوار کھا تھا، اب مسئلہ بنا کہ نذر محمد صاحب کی جھگی کہاں ہے؟ لہذا انہوں نے کمال ہوشیاری سے انی کی جھگی (کمرے) کو شفٹنگ والے روز دو حصوں میں تقسیم کر کے نذر محمد کو کوارٹر الاٹ کروایا دیا۔ بشیر چاچا سے کہا کہ راشن کارڈ بنوالو مگر انہوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ بہر حال محکمہ آبادکاری (Rehabilitation) والوں نے لانڈھی شفٹ کر دیا۔

××شفٹنگ کا قصہ ختم ہوا××

شریف بھائی صاحب کا بھینسوں کا باڑہ تھا، لہذا انہوں نے ایک کونے کے کوارٹر پر قبضہ جمالیا۔ محکمے والوں نے اپنی لسٹ کے حساب سے الاٹمنٹ دیے تھے اور کوارٹر الاٹ کیے تھے۔ مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بہر حال باہمی افہام و تفہیم سے ایک کوارٹر پسند کر کے شفٹ ہو گئے۔ کوارٹروں کے نمبر کی درستگی تقریباً پندرہ سال کے بعد ہوئی۔ شفٹنگ کے دوسرے روز "انی" اور مجید خالو (پھوپھا) لانڈھی آ گئے۔ چھوٹی خالہ، تائی (شبر کی والدہ) ظفر بھائی بھی لانڈھی شفٹ ہو گئے۔ 20 کوارٹروں کی گلی میں 10-12 گھر آباد ہوئے باقی لوگ جیل روڈ حیدر آباد کالونی اور شہر میں رہ رہے تھے۔ کوارٹروں کے فرش اور کمروں کے فرش کچے تھے اور صحن بھی کچا تھا۔ 'انی' کے بچے سلطانہ-نواب-اقبال لانڈھی سے جیل روڈ بہادر یار جنگ اسکول میں پڑھنے آتے تھے۔ گلی میں صرف شبیر، توفیق اور سلیم بھائی کی فیملی گزارا کر رہے تھیں۔ شبیر ماموں کی فیملی حیدر آباد کالونی میں مکان نمبر 129 میں کرائے پر رہتی تھی۔ اسلام آباد کی سے قریب تھا۔ صرف روڈ کراس کرنا پڑتا تھا۔ اسلام آباد کے ساتھ حیدر آباد کالونی سے بھی رابطہ جڑا رہا۔ انی کے بچے بہادر یار جنگ اسکول میں پڑھنے لانڈھی سے حیدر آباد کالونی آتے تھے۔ عبداللہ کے والد صالح میاں کی حیدر آباد کالونی میں کریانہ (karyana) کی دکان تھی۔ بشیر چاچا صاحب اس وقت KDA کے واٹر بورڈ میں ڈرائیور کم ورک مستری کام کر رہے تھے۔ ان کی ڈیوٹی منو بھائی (عبداللطیف خان صاحب) کے پاس تھی، لہذا وہ بھی انی کے بچوں کے ساتھ جیل روڈ آتے تھے۔

بچوں کو اسکول چھوڑ کر نیشنل اسٹیڈیم پہاڑی پر عبداللطیف خان کے گھر ڈیوٹی پر چلے جاتے تھے۔ جب دل چاہا ڈیوٹی پر جاتے تھے اور جب موڈ ہوا چھٹی کر لیتے تھے، کیونکہ محکمے کے سربراہ عبداللطیف خاں تھے۔ والد صاحب بھی ڈیوٹی کے بعد شبیر چاچا کی طرح خان صاحب کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ کبھی کبھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ بھی پکڑ لیتے تھے۔ ٹھیکیداری کا خاندانی تجربہ تو تھا ہی، نئے ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر کام بھی کر لیتے تھے۔ جس سے وقت پاس ہو جاتا تھا۔ والد صاحب کی ٹھیکیداری سے گھر والوں کو کوئی سپورٹ نہیں ملی۔

گزرتے وقت کے ساتھ انڈیا میں حالات خراب ہونے لگے دادا صاحب کا کاروبار بالکل ختم ہو گیا۔ ابراہیم ماموں نے بھی ٹھیکیداری پر انحصار کم کر دیا۔ ٹرک چلوانے لگے، کرش کا پلانٹ لگالیا اور ریڈیو کی ایجنسی کا کاروبار شروع کر دیا۔ "مرفی" ریڈیو کی اور دیگر ایٹم کی ایجنسی لے لی۔

باوا جی (دادا صاحب) چار خاندانوں کی کفالت کر رہے تھے۔ دو گھر داماد، ایک سالے صاحب اور دو برخوردار ن۔ کاروبار سے ہٹ کر اہم مسئلہ نواسیوں کی شادی کا تھا۔ انڈیا میں رشتے مل نہیں رہے تھے، حیدر آبادیوں میں کرنا نہیں چاہتے تھے۔ صرف سالے صاحب ماما حنیف کی دوسری شادی حیدر آبادیوں میں کر دی تھی۔ بہر حال کاروبار کی بندش اور نواسیوں کی شادی اور رشتوں کے چکر میں پاکستان آنا پڑا۔ مختصر اجائیداد فروخت کر کے گزارہ کر رہے تھے۔ سونے پر سہاگا دونوں داماد جو کثیر العیال جن کے افراد خانہ اور سالے صاحب اور ان کی اولاد جملہ 22 افراد پر مشتمل تھی بشمول دادا دادی (غلام قادر خان) 11 افراد نیاز محمد خان چار افراد اور حنیف خان کے 6 افراد ہمارے پھوپھا صاحبان کی دانست میں۔ والد صاحب اور چچا صاحب سے مشورہ گناہ کبیرہ تھا۔ بہر حال حافظ شفیع احمد خان صاحب کی کشتی بیچ سمندر میں پھنس گئی۔ 1960ء کے ابتدائی ایام میں دادا صاحب و دادی صاحبہ، دامادوں، سالے کی فیملی اور نواسوں نواسیوں کے پاکستان تشریف لے آئیے۔ میں اس وقت نویں 9th جماعت کا طالب علم تھا۔ دادا صاحب کے کنبہ میں کوئی بچہ میٹرک پاس نہیں تھا۔ صرف نواسی طاہرہ نے حیدر آباد دکن سے میٹرک پاس کیا تھا، وہ بھی بے کار ہو گیا۔ اسے پاکستان میں دوبارہ میٹرک کا امتحان دینا پڑا، اس وقت 'میں 'لانڈھی بالی اسکول کا طالب علم تھا۔ میٹرک والی بچیاں لانڈھی گرلز ہائی سکول میں اور دیگر لڑکیاں کورنگی نمبر 6 کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ یہ وہ دور تھا۔ جب سرکاری اسکولوں میں 9th اور میٹرک کی فیس تین روپے ماہانہ تھی، جو چھ چھ ماہ ادا نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ سے ہمارا نام خارج ہو جاتا تھا۔ ہماری دادی صاحبہ کو ہماری تعلیم سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ تو صرف اپنی نواسیوں اور نواسوں کی فیس وقت پر ادا کرتی تھی۔ ایک دفعہ دادی صاحبہ نے میری فیس لے کر نواسی کی فیس ادا کر دی اور میرا نام کٹ گیا۔ میں سالانہ امتحان میں 9th میں انگلش کے مضمون میں فیل ہو گیا۔ دوبارہ میٹرک کے لیے 9th میں داخلہ لیا۔ مگر مالی حالات کی وجہ سے مجھے (توفیق) نذیر اور جلیل کو بڑی تگ و دو کر کے ڈاکیارڈ کی اپرنٹس شام میں داخلہ دلوایا گیا۔ نذیر نے تو میڈیکل میں گڑبڑ کر کے اپنی جان چھڑالی۔ میں اور جلیل پھنس گئے۔ ڈاکیارڈ کی اپرینٹس شپ انجینئرنگ اپرینٹس شپ تھی۔ یہ واقعہ 1960ء کا ہے۔ چار سال تک ہفتے میں دو روز اپرینٹس شپ اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ اور باقی چار دن پی این ڈاکیارڈ کی ورکشاپوں میں جانا پڑتا تھا۔ شروع میں ہم 60 اپرینٹس سلیکٹ ہوئے تھے۔ جس میں سے چار لڑکے انٹر پاس تھے، دس یا بارہ لڑکے میٹرک پاس، بقایا لڑکے بھی اپرینٹس نان میٹرک تھے۔ 1960ء سے 1965ء کا دور بڑا سخت تھا۔ ڈاکیارڈ میں دل نہیں لگتا تھا۔ صبح صبح 6 بجے گھر سے نکلنا پڑتا تھا، تاخیر کی وجہ سے ہفتے میں دو تین چھٹی ہو جاتی تھی۔ ڈاکیارڈ کے بجائے کارساز میں اسکول برابر پابندی سے جاتا تھا۔ اسکول کا نام P.N.S Dockyard School تھا، کیونکہ اسکول میں باوردی افسران، لیفٹیننٹ اور لیفٹیننٹ کمانڈر لیول کے افسران پڑھاتے تھے۔ صاف ستھرا ماحول اعلی بلڈنگ اعلی فرنیچر ہوتا تھا۔ ڈاکیارڈ میں ورکشاپ کا ماحول تھا یعنی چھوٹے اور استاد کا ماحول تھا، جو میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ دادا صاحب اور پھوپھا صاحب کی فیملی کی وجہ سے کوارٹر چھوٹے پڑ رہے تھے۔ اس دوران ماموں حنیف کی فیملی پنجاب قصبہ گروچک 23/sp چلی گئی۔ وہاں گاؤں والوں نے ان کی آبائی زمین کا حصہ جو ان کا بنتا تھا، چچازاد بھائیوں سے دلوادیا۔ بہر حال ایک فیملی پنجاب چلی گئی۔ دادا صاحب کا انڈیا چھوڑنے کا اصل مقصد نواسیوں کے

رشتوں کا تھا۔ 1960ء کا دور دادا صاحب کے ابتدائی زوال کا دور تھا۔ بچی کچی جائیداد فروخت کر کے پاکستان میں مستقل قیام کر لیا لانڈھی کے کوارٹر تھے۔ بڑی فیملی اور آمدنی "صفر" صرف رفیق بھائی موٹر مکینک کی جاب کرتے تھے۔ جس سے 25 افراد کے کنبے کا خرچہ چلنا مشکل تھا رفیق بھائی صاحب بھی کم آمدنی اور زیادہ خرچ کی وجہ سے پریشان ہو گئے۔ انہوں نے باہر جانے کی تگ و دو شروع کر دی۔ اور انگلینڈ کا ورک پرمٹ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی۔ رشتے نہ ملنے پر دادا صاحب خصوصی طور پر اور تمام گھر والے عمومی طور پر پریشان تھے۔ اور روز روز نئی منطق شروع ہو جاتی تھی۔ والدہ صاحبہ، دادا صاحب کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھیں۔ لوگوں نے مشورہ دیا، خورشید آپا اور جعفری آپا کا رشتہ ولی ماموں کے بیٹوں سے کر دیا جائے۔ عمروں کا بڑا فرق تھا۔ لہذا ہم لوگوں کی جان چھوٹ گئی۔ 'شبر' کی والدہ اور والدہ صاحبہ نے رشتے تلاش کرنے میں بڑی محنت کی۔ نیاز محمد پھوپھا اپنی بیٹیوں کی شادی اپنے چچازاد بھائی 'ادریس' کے بیٹوں سے کرنا چاہتے تھے اور وہ رشتے و تجویز کو Reject کر دیتے تھے۔ اور ہماری دادی نیاز محمد کے مشوروں کو Reject کر دیتی تھی ۔ دادی صاحبہ اپنی نواسیوں کی شادی کراچی میں اور زیادہ سے زیادہ سندھ میں کرنے کی خواہشمند تھیں اور باپ نیاز محمد پنجاب میں۔ نیاز محمد کی تقریباً 60 ایکڑ خاندانی زمین جس کے وہ اکلوتے مالک تھے۔ کہروڑ پکا میں شہر کے قریب تھی، مگر وہ اپنے چچازاد بھائیوں کو تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے۔ چاہے ان کے سسر فاقے کریں۔ 1960ء سے 1962ء تک بہت سخت حالات تھے۔ 1963ء میں طاہرہ نے پرائمری سکول کی ٹریننگ کر کے نوکری 'پرائمری اسکول' میں شروع کر دی۔ خورشید آپا اور جعفری آپا کے رشتے مل گئے اور ان کی شادیاں ہو گئیں۔ جمیل بھائی نے KRTC میں کنڈکٹری شروع کر دی۔ ہمارے وزیر نے میٹرک کے بعد کلرک کم ٹائپسٹ کی ADA میں نوکری کر لی۔ 1960ء سے 1964ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

اس کے بعد ایک اور گروپ کی لڑکیوں کی دادا صاحب کی ذمہ داری تھی۔ افسری-طاہرہ- قمر کی شادی تک دادا صاحب کی پریشانی اپنی جگہ پر تھی، جو کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ان حالات میں عبداللطیف خان نے بہت اخلاقی مدد کی اور والد صاحب کو ایک بڑا ٹھیکا برساتی نالوں کورنگی K ایریا سے کرنگی نمبر 5 تک دلوا دیا۔ اب والد صاحب کے دل میں بھانجوں کی محبت جاگ گئی۔ والد صاحب نے ٹینڈر 'جمیل' کے نام پر داخل کر کے ٹھیکہ لے لیا۔ یہ ٹینڈر آگے جا کر پندرہ سے بیس لاکھ کا ہو گیا۔ والد صاحب چاہتے تو اپنے نام کا ٹینڈر بھر کے لے لیتے۔ والد صاحب کو اپنے بہنوئی صاحب کی مدد کرنی تھی، اس ٹھیکہ میں چار حصہ دار یعنی 4 پارٹنر تھے۔ ابا جان، مجید خالو (پھوپھا) عبداللطیف خان صاحب اور غلام قادر خان صاحب۔ بہر حال 1963ء کے آخر میں نالوں کا کام شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں 'گورنمنٹ' سریا (لوہا) اور سیمنٹ خود دیتی تھی۔ 'گورنمنٹ' نے سریا اور سیمنٹ دینا شروع کیا۔ جمیل بھائی کی لاٹری نکل گئی اور جمیل بھائی کا کاروبار شروع ہو گیا۔ سیمنٹ اور سریا پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ جس پر والد صاحب نے منع کیا تو جمیل بھائی اور پھوپھا غلام قادر شیر ہو گئے اور کہا "ٹھیکہ ہمارا ہے "ہم جیسے چاہیں کریں۔ باقی تینوں پارٹنرز کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ باقی تینوں پارٹنرز پنچایت بازی کر کے اور گالیاں دے کر خاموش ہو گئے۔ اس طرح 1964 سال گزر گیا۔ نالے کا کام بھی 'گورنمنٹ' کے پاس فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ جمیل بھائی پھر KPTC لوٹ گئے۔ اس دوران نواب شاہ میں محمد علی ماموں کے انتقال کے بعد ان کی دو بیٹیوں زلیخا اور زبیدہ کے رشتوں کا معاملہ آ گیا۔ والدہ صاحبہ کا پھر امتحان شروع ہو گیا، انہوں نے پھر قربانی دینے کی ٹھانی۔ عزیزوں کے کہنے پر اپنے بیٹوں کے رشتے کرنے کی پلاننگ شروع کر لی، ممانی صاحبہ "آمنہ" عرف (منہ) نے رضامندی ظاہر کر دی۔ یہ ایک نیا 'باب' شروع ہو گیا۔ رفیق بھائی صاحب 1962ء میں لندن چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے اپنی شادی کا چکر شروع کر دیا، والدہ صاحبہ کو بڑی خفت اٹھانی پڑی۔ والدہ صاحبہ نے بھائی صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے لہذا والدہ صاحبہ کو معذرت کرنی پڑی ۔ بفضل اللہ تعالی یہ 'چیپٹر' بھی ختم ہو گیا۔ 1963ء سے 1965ء کے عرصے میں بھائی صاحب وقتاً فوقتاً کچھ مالی معاونت کرتے رہتے تھے۔ جس سے مالی مشکلات میں تھوڑی بہت کمی ہوئی۔ 1964 میں ڈاکیارڈ ٹیکنکل اسکول کا تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔ ابھی ایک سال ورکشاپ کا کام باقی تھا۔ ڈاکیارڈ اسکول کا سرٹیفکیٹ میٹرک کے مساوی تھا۔ انٹر

سائنس میں داخلہ مل سکتا تھا، اس سرٹیفکیٹ سے پورے انڈیا پاکستان میں انٹر سائنس میں میں داخلہ مل سکتا تھا۔ لیکن کراچی اور سندھ میں نہیں۔ میں نے ایک نائٹ کالج میں جو لاہور یونیورسٹی سے منظور شدہ تھا، داخلہ لے لیا (نوٹ اس زمانے میں انٹر بورڈ نہیں تھے)۔ میں نے پنجاب سے انٹر کا امتحان دینے کی کوشش کی تیاری بھی شروع کی مگر مالی حالات کی وجہ سے معاملہ آگے نہ بڑھ سکا، آخر کار بوجہ مجبوری کراچی بورڈ سے نویں دسویں کا امتحان کمبائن 1965ء میں اکٹھا بحیثیت پرائیویٹ امیدوار کراچی بورڈ سے دیا۔ میٹرک کا نتیجہ بھی ایک ڈرامہ رہا۔ ڈاکیارڈ کے چکر میں پڑھنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا اور ناہی موڈ ہوتا تھا۔ ٹیوشن وغیرہ کا بھی کوئی آسرا نہیں تھا۔ اللہ کا نام لے کر امتحان دیا۔ امتحان دینے میں والدہ صاحبہ کا ہاتھ تھا ہی مگر 'تپلی' اور 'انی' کی بیٹی سلطانہ جو اس وقت ہوم اکنامکس کالج مقابل آغا ہسپتال میں B.sc کی سٹوڈنٹ تھی۔ بہت ہمت دلوائی اور زور دیا کہ بس 'تو' امتحان میں بیٹھ جا، پاس ہو جائے گا۔ خدا خدا کر کے امتحان دیا۔ طیب علی علوی اسکول جو سٹی کورٹ کے بالکل سامنے تھا، ہمارا سنٹر بنا، جلیل نے تو خوب نقل ماری، 'میں' بزدل تھا، لہذا گزارا کیا بس صرف دو ماہ بعد نتیجہ آگیا۔ سب عزیزوں کا خیال تھا کہ میں پاس ہو جاؤں گا کیونکہ امتحان والے روز کتاب الٹ پلٹ کر لیتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے رزلٹ آیا، کورنگی نمبر 5 کے ایک ٹیوشن سینٹر پر جا کر محترم استاد کو اپنا اور جلیل کا رول نمبر دیا۔ استاد صاحب نے فرمایا اوپر والا نمبر 'پاس' کی لسٹ میں نہیں ہے اور نیچے والا نمبر جو جلیل کا تھا، "تھرڈ ڈویژن" میں پاس ہو گیا ہے۔ تمام اخبار چھان مارا اور ڈویژن کا نتیجہ دیکھتے رہے اور فرسٹ ڈویژن میں بھی دیکھا مگر ناکامی ہوئی، تپلی اور سلطانہ بہت روئیں کہا جلیل پاس ہو گیا۔ جلیل تو تمام رات سو رہا تھا، وہ پاس ہو گیا اور ہمارا بھائی رہ گیا۔ اس دور میں ماجد بھائی بھی لانڈھی میں ہمارے ساتھ رہے تھے۔ میری حوصلہ افزائی کی اور 'میں'، یعقوب، جلیل اور قیوم کو رات 12 بجے ریکارڈنگ والے ہوٹل میں چائے پلانے لے گئے۔ جو بس اسٹاپ کورنگی نمبر 6 پر واقع تھا۔ یعقوب بھائی بچارے رزلٹ معلوم کرنے گھر آئے تھے، وہ بھی بہت افسوس کر رہے تھے کہنے لگے یار جلیل پاس ہو سکتا ہے تو تم کیوں نہیں ہوئے۔ بہر حال ہوٹل میں چائے پی رہے تھے ہمارے ساتھ والی ٹیبل پر ایک صاحب رزلٹ والا اخبار لیے بیٹھے تھے، یعقوب بھائی نے مسکین سی صورت بنا کر اخبار مانگا اور فرسٹ ڈویژن سے نتیجہ دیکھنا شروع کیا اس کے بعد سیکنڈ ڈویژن کا نتیجہ دیکھا اور ایک جگہ ٹھہر گیا اور ماجد بھائی سے رول نمبر کی تصدیق کی اور ماجد بھائی کو میرے ایڈمٹ کارڈ سے (جو اس وقت ماجد بھائی کے پاس تھا) نمبر ملا کر دیکھنے کو کہا نمبر ٹریس ہونے پر چیخ کر کہا 'تو' پاس ہو گیا اور نمبر پر پنسل سے نشان لگا دیا۔ میں نے یعقوب بھائی سے جھٹ کر اخبار لیا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی تاکہ اماں جان کو آج اچھی خبر سناؤں کہ انہیں زیادہ دکھ تھا۔ اندھیرے میں ڈر سے راستے میں چپل بھی پیروں سے نکل گئی، میرے پیچھے یعقوب تھے اور وہ میری چپلوں کو سمیٹ رہے تھے۔ میں ایک منٹ کے اندر گھر پہنچ گیا۔ اماں جان کو خوشخبری سنائی، انہوں نے مجھے گلے لگا، پھر سجدے میں گر گئی شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ تپلی اور سلطانہ خوشی سے رو رہی تھی۔ بہر حال یہ زندگی کی بڑی خوشی تھی اس دوران گھر کے دیگر افراد جمع ہو گئے تھے اور اماں جان کو مبارکباد دینے لگے۔ ماجد بھائی جو ہوٹل میں رہ گئے، اخبار والے صاحب سے معذرت کر کے مٹھائی لے کر گھر آگئے۔ انہوں نے تمام گھر والوں کو مٹھائی کھلائی، یعقوب بھائی بھی بہت خوش ہوئے اور تمام گھر والے بھی خوش تھے۔ بڑی اماں 'دادی' بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ میرا دل ڈاکیارڈ میں نہیں لگ رہا تھا لہٰذا میں نے استعفیٰ دینے کا پروگرام بنا لیا اور نیشنل شپنگ کارپوریشن میں پھر سے 5th انجینئر کے لیے اپلائی کر دیا۔ چار چھ ماہ بعد اتفاق سے مجھے چانس مل گیا۔ 'ڈاکیارڈ' والوں نے بھی میرا استعفیٰ منظور کر لیا۔ استعفیٰ مشروط تھا۔ والد صاحب اور گارنٹر ڈاکیارڈ آئیں اور استعفی کی تصدیق اور وظیفے کے چار ہزار روپے واپس کر دیں۔ رقم یکمشت ادا کرنے کی شرط تھی، حالات ایسے تھے کہ تین چار ہزار کا فوری بندوبست نہ ہو سکا۔ نہ والد صاحب اور اور چچا صاحب ہاتھ آرہے تھے۔ غلام قادر صاحب کی فیملی کو بھی جلیل کو ڈاکیارڈ سے نکالنے کا پروگرام نہیں تھا۔ عزیزوں نے مخالفت کی اور کچھ حالات نے ایسی صورت میں خاموشی اختیار کی۔ موقع ضائع ہو گیا۔ ڈاکیارڈ میں دلچسپی کم ہو گئی، میں بھی زیادہ چھٹیاں کرنے لگا۔ ڈپارٹمنٹ کے کئی افراد سے "تو تو میں میں" ہونے لگی، کچھ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔ میرا مشروط استعفی تو ڈاکیارڈ والوں کے پاس تھا۔ 30 مارچ 1966ء کو میری

سروس سے مجھے فارغ کر دیا گیا۔30 مارچ کو میں کینٹین سے لنچ کر کے گھر جانے کا پروگرام بنالیا،اس دوران لنچ اخبار پر میری نظر پڑی، "فزیکل کالج میں ٹیچر ٹریننگ "30 مارچ آخری فیصلہ تھی۔ میں ڈاکیارڈ سے سعید منزل سے ہوتے ہوئے صدر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سعید منزل پر پہنچ گیا، ساڑھے تین بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ میڈیکل ایجوکیشن برانچ میں افتخار صاحب کے پاس گیا،انہوں نے اوپر سے نیچے غور سے دیکھا اور کہا بھائی یہ فارم لو اور ضروری کاغذات لگاؤ۔ میں نے کہا سر اس وقت میرے پاس کاغذات نہیں ہیں، کاغذات لینے مجھے لانڈھی جانا پڑے گا۔ یہ تو بہت مشکل ہے انہوں نے دوبارہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا واقعی داخلے کے خواہشمند ہو تو کل 31 مارچ کی صبح دس بجے تک کاغذات جمع کرا دو۔ میں فارم پر تمہارا نام لکھ کر رکھ لیتا ہوں۔ اگر صبح گیارہ بجے تک نہیں آئے تو تمھارا فارم ضائع ہو جائے گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے گھر پہنچا اور اماں جان سے ساری روداد سنائی۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا صرف کہا اللہ کی مرضی۔ میں نے مشورہ مانگا انہوں نے کہا اب تو تم فارغ ہو کوشش کر کے دیکھ لو۔ بہر حال میں نے داخلے کا م فارم جمع کروا دیا۔ اپریل میں انٹرویو ہوئے اور جولائی میں داخل فائنل ہو گئے۔ بفضل اللہ تعالی میرا داخلہ ہو گیا۔ یکم اگست 1966ء سے کلاسس لگنی شروع ہو گئی۔ کالج کے اوقات دوپہر ڈیڑھ بجے سے شام ساڑھے پانچ بجے تھے۔ سیکنڈ شفٹ میں کلاسس جیکب لائن ٹیکنکل اسکول میں ہوتی تھی۔

کیونکہ کالج ناظم آباد میں زیر تعمیر تھا۔ اگست 1966ء سے کالج جانا شروع کیا۔ پہلا بیچ چالیس اسٹوڈنٹ کا تھا۔ جس میں 27 میل اور 13 فیمیل طلبہ و طالبات تھے۔ ایک نئی مصروفیت شروع ہو گی۔ بھائی صاحب اس وقت گھر کے اخراجات کے لیے پیسے بھیجتے رہتے تھے۔ اس دوران بلدیہ کورنگی کا قیام عمل میں آیا۔ میں نے بلدیہ میں نوکری کے لیے درخواست دی۔ بلدیہ میں گروپ آکڑے کلرک کی بھرتی کا تھا۔ اتفاق سے انٹرویو چیف آفیسر صاحب وہ مجھے جانتے تھے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ چیف صاحب نے درخواست پر لکھے ہوئے نام دیکھے اور پوچھا کراچی سے پہلے کہاں رہتے تھے میں نے بتلایا نوابشاہ انہوں نے کہا تمہارا سلیکشن ہو گیا ہے۔ اب بتاؤ کہاں رہتے ہو؟ اور والد صاحب کیسے ہیں؟ لہذا یہ تھی میری پہلی نوکری کی تفصیل۔ میں بڑے اطمینان سے نوکری کرتا رہا۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ میرے گروپ کے تمام ساتھی آفیسر بنے۔ اگر میں بلدیہ کی نوکری میں ہوتا تو میں بھی تین سال بعد افسر بن جاتا۔ میں نے ایک سال بعد نوکری چھوڑ دی۔ جون جولائی میں جو ڈپلومہ کے امتحان ہو رہے تھے۔ میں نے چیئرمین بلدیہ جناب فیصل صاحب سے چھٹی مانگی مگر انہوں نے چھٹی منظور کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے چیئرمین صاحب سے کہا کہ اگر آپ چھٹی منظور نہیں کریں گے تو میں مجبوراً استعفی دے دوں گا یعنی دے رہا ہوں ہو۔ کیونکہ میرے امتحان ہو رہے ہیں۔ بہر حال میں امتحان دینے کے بعد بلدیہ کی جاب پر نہیں گیا۔ اسی دوران مجھے جامعہ ملیہ اسکول ملیر میں جاب مل گئی۔ ابھی تک میرا نتیجہ نہیں آیا تھا۔ انٹرویو بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر محمود حسین صاحب تھے۔ وہ بانی جامعہ ملیہ کراچی تھے۔ انہوں نے مجھے سلیکٹ کر لیا۔ میں نے جامعہ ملیہ سیکنڈری سکول میں "فزیکل انسٹرکٹر" کی جاب شروع کر دی انہوں نے یہ شرط لگائی کے میں وارڈن شپ بھی کروں گا۔ میں نے منظور کر لیا۔ بہر حال وارڈن شپ قبول کرنے کے بعد میں 24 گھنٹے کا ملازم ہو گیا۔ جمعرات کو گھر جاتا تھا اور جمعہ کی شام واپس اسکول آجاتا تھا اور یہ نوکری ایک طرح سے مجبوری میں کرتا تھا، مگر میں نے جامعہ ملیہ سے بہت کچھ حاصل کیا کیا۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب سے ون ٹو ون ملاقات ہوئی۔ بڑے شفیق اور نرم خو شخصیت کے مالک تھے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں وہ مجھے میرے نام سے واقف ہونے کی وجہ سے نام لے کر مخاطب کرتے تھے۔ بہت سے سینئر اساتذہ بھی ڈاکٹر صاحب سے بالمشافہ بات کرنے سے گھبراتے تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ میں نے پندرہ ماہ کے قلیل عرصے میں وہ کچھ سیکھا جو میں برسوں میں نہیں سیکھ سکتا تھا۔ رزلٹ کے بعد سرکاری ملازمت کی کوششیں شروع کر دیں۔ رزلٹ میں میرا چھٹا نمبر تھا، ہمارے پرنسپل جناب رضوی صاحب نے ڈائریکٹر ایجوکیشن صاحب سے کہا کہ پہلا بیچ ہے آپ سنیارٹی کے حساب امیدواروں کا چناؤ کریں۔ پہلے جو طلبہ نوکری میں نہیں ہیں انہیں موقع دیں اور پہلے فریش Candidate کو لیٹر دیں اس طرح میں دوسرے نمبر پر آگیا۔ ستمبر 1967 کو مجھے بارہ بجے دن کو لیٹر

مل گیا۔ لانڈھی ہائی سکول میں جوائن کرنے کو کہا گیا میں دو بجے لانڈھی پہنچ گیا۔ لہذا میرا لانڈھی نمبر 1 کے ہائی اسکول سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ محمد خان صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب تھے انہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا ابھی میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ محبوب صاحب جو ہمارے استاد تھے تشریف لے آئے اور اپنے مخصوص انداز میں کہا ابے کیسے آیا؟ دوسرا سوال تھا مجید صاحب کے کیا حال ہیں؟ میں نے کہا سر ٹھیک ہیں۔ میں پھر خاموش کھڑا رہا۔ اب محمد خان صاحب جو ہیڈ ماسٹر تھے محبوب صاحب سے کہا ابھی یہ آپ کے اسٹاف ممبر ہیں۔ محبوب صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ابے بیٹھ کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ یہ میرا سرکاری ملازمت کا پہلا دن تھا۔ تقریبا تین ماہ میں لانڈھی ہائی سکول میں رہا۔ جنوری 1968ء میں میرا تبادلہ کورنگی نمبر 4 گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول نمبر 4 میں میں صبح کی شفٹ میں ہو گیا۔ جناب ارشاد بیگ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ میں GBSS no 4 کورنگی نمبر 4 کے اسکول میں تقریبا اٹھائیس سال تک رہا۔ درمیان میں صرف ایک ماہ کے لیے جیکب لائن ٹیکنکل اسکول میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ بہر حال 1967ء سے 1970ء نارمل زندگی گزر رہی تھی ۔"پتلی" فیکٹری میں جاب کر رہی تھی۔ 1970ء میں ابراہیم ماموں صاحب انڈیا سے تشریف لائے۔ میں اور والدہ صاحبہ نیپر بریک صبح صبح پہنچ گئے۔ وہاں محترم شبیر ماموں صاحب بمعہ اپنے برخوردار کے موجود تھے۔ شبیر ماموں، شجاعت ابراہیم ماموں، مامی صاحبہ اور شمع کو لینے سی پورٹ کیماڑی پہنچ گئے۔ جہاز گودی پر کھڑا تھا ابھی مسافر پانی کے جہاز سے اترنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ 'میں'، یعقوب بھائی۔ شبیر ماموں اور والدہ صاحبہ Railing کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ آدھے گھنٹے بعد مسافر اترنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ابراہیم ماموں اپنی فیملی کے ساتھ نظر آئے۔ شبیر ماموں نے ہاتھ ہلا کر استقبال کیا۔ ابراھیم ماموں کسٹم ہال جانے سے پہلے railing کے قریب آئے پھر کسٹم ہال میں چلے گئے۔ ایک گھنٹے بعد ماموں صاحب فارغ ہو کر باہر نکلے۔ والدہ صاحبہ، شبیر ماموں، یعقوب شجاعت اور ابراہیم ماموں کی فیملی نیپر صدر روانہ ہوئے۔ یعقوب بھائی نے اونٹ گاڑی سوار کر دیا حکم دیا۔ ہم لوگ گھر جا رہے ہیں تم اونٹ گاڑی پر بیٹھ جاؤ اور سامان لے کر نیپر بریکس گھر پہنچوں۔ بہر حال والدہ صاحبہ اپنے بھائی صاحب سے مل کر لانڈھی روانہ ہو گئیں۔ ابراہیم ماموں نے دو دن بعد کرائے کے مکان میں حیدر آباد کالونی میں شفٹ ہو گئے۔ گھر بہت چھوٹا تھا۔ بہر حال چند ماہ بعد حیدر آباد کالونی میں گزارنے کے بعد لانڈھی میں منتقل ہو گئے۔ ابراہیم ماموں ہندوستان میں Well Set تھے۔ سال 1970ء گزر گیا۔ 1971ء کی جنگ کے بعد ابراہیم ماموں کا انڈیا سے رابطہ اور خط وکتابت ختم ہو گئی۔ مالی معاونت میں بھی کمی ہو گی حالات جنگ کے بعد سخت ہو گئے۔ بہر حال ان کے بھتیجے اشفاق اور اقبال اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہے اور ممکنہ طور پر ان کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ اس طرح سال 1971ء گزر گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ شادی کی بات چیت مکمل ہو گئی میں اماں جان کی آنکھوں کا معائنہ اور موتیا کے آپریشن کے سلسلے میں اماں جان کو ڈاکٹر صالح۔۔۔۔ کے پاس شام کے وقت ریمبو سینما لے جاتا رہتا تھا۔ ایک دن میں لانڈھی بس اسٹاپ سے نکل کر ایمپریس مارکیٹ کے سامنے اماں جان کا ہاتھ پکڑ کے گزر رہا تھا تو اماں جان نے پوچھا تیری کتنی عمر ہو گئی ہے؟ میں نے کہا 28 سال۔ اماں جان یک دم بولی بہت دیر ہو گئی ہے اب تک تو تیری شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ گھر آنے کے بعد اماں جان نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا اور رشتے کی تلاش شروع کر دی اور بہن صاحبہ بھی سرگرم ہو گئی۔ ناموں کی ایک فہرست بنائی اور مہم شروع کر دی۔ اسی تگ و دو میں سال 1972ء شروع ہو گیا۔ منہ مامی نے محمود کی شادی کا تقاضہ شروع کر دیا۔ بہر حال بھائی صاحب سے خط وکتابت کے بعد شادی کی تاریخ 11 فروری 1971ء دے دی گئی اور بھائی صاحب فروری کے پہلے ہفتے میں معہ بیگم تشریف لے آئے۔

پتلی کی شادی کے بعد بھائی صاحب کی مصروفیات کم ہوئی تو انہیں ایک نئے event کی اور مصروفیت کی مل گئی۔ اماں جان اپنی سوچوں میں تھیں۔ بھائی صاحب نے والدہ سے کہا کے رشتے بتلائیں۔ اماں جان نے تین لڑکیوں کا انتخاب کر رکھا تھا جو سب قریبی لوگ تھے۔ اماں جان نے بھائی صاحب کو تین رشتوں کا بتلا دیا اور پہلے نمبر پر ابراہیم ماموں سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بھائی صاحب نے کہا کے آپ چھوڑیں۔ میں ماموں سے خود بات کر

لوں گا۔ پہلی ترجیح ابراہیم ماموں سے بات کرنے کی ہوئی اللہ تعالی کے فضل و کرم سے بھائی صاحب نے ماموں کو راضی کر لیا۔ تمام خاندان کی اندرونی مخالفت بہت زیادہ تھی یہاں تک کہ بڑی اماں اور انی وغیرہ بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی صاحب ایڈوانس میں ماموں کو اندرون خانہ راضی کر لیا۔ صرف نارمل بات چیت کے لئے بڑی ماں اور انی کو ابراہیم ماموں کی خدمت میں روانہ کیا اور ساتھ میں بھائی صاحب بھی گئے۔ بڑی اماں نے بے دلی سے رشتہ مانگا بھائی صاحب نے کمال ہوشیاری سے بات آگے چلائی اور ماموں صاحب سے ہاں کروالی۔ عبداللہ، کریما اور شبیر ماموں وغیرہ نے کافی مخالفت کی لیکن ماموں اور ممانی صاحبہ نے "شکوری" جیسی (اماں جان) بہن کا رشتہ قبول کر لیا۔ عبداللہ صاحب نے بھی بڑی مخالفت کی۔ کہا کہ حق تو چچازاد کا بنتا ہے اور "جتنی تنخواہ توفیق کی ہے اتنے پیسوں کی تو میری بہن ایک ماہ میں بسکٹ کھاتی ہے"۔ انڈیا والے بھی راضی نہیں تھے مگر ماموں صاحب نے بہن کے بیٹے کا رشتہ قبول کر لیا۔ اس طرح اگست 1974 میں شادی ہو گی۔ بہت سے رشتے داروں نے نے طعنے دیے اور نہ خوشی کا اظہار کیا۔ اللہ تعالی کے حکم سے شادی کے چند ماہ بعد میرا پروموشن گریڈ 8 سے گریڈ 14 میں ہو گیا تھوڑی تنخواہ بڑھ گئی۔ 1974 میں حالات نارمل رہے۔ 1974ء میں عظمیٰ میں پیدا ہوئی اور 1975ء میں میں توصیف پیدا ہوا۔ حالات پھر ٹائٹ ہونے لگے۔ شمع نے شادی کے بعد پرائیویٹ B.A کر لیا تھا اور 1975ء میں C.T کی ٹیچر ٹریننگ میں داخلہ لے لیا۔ بہر حال 1975 میں پرائمری ٹیچر کی ملازمت اختیار کر لی تو گھر کے حالات آمدنی کے حساب سے کچھ بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ عظمیٰ اور توقیر کے بعد مارچ 1980 میں تنویر پیدا ہوا۔ 80-12-18 کو ابراہیم ماموں صاحب کا انڈیا میں انتقال ہو گیا۔ ماموں کے انتقال پر شمع توقیر کو لے کر انڈیا چلی گئی۔ تنویر بہت چھوٹا تھا لہذا تنویر کو اماں جان کے سپرد کر کے 15 دن کے لیے نظام آباد انڈیا اسے ہو کر جنوری 1981 واپس پاکستان آ گئی۔ تحسین نومبر 1981 میں پیدا ہوا۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا اور حالات اللہ کے فضل سے بہتر رہے۔ اور اپریل 1983 میں گھر میں ایک حادثہ تنویر کی آنکھ میں چوٹ لگنے کا ہوا جس سے گھر میں کافی پریشانی ہوئی۔ اللہ تعالی نے بڑا کرم کیا تنویر کی آنکھوں کو صحت عطا ہوئی۔ عبداللہ حیدر آباد کاٹی میں کام ملنے کے بعد حیدر آباد منتقل ہو گیا تھا اس لیے شمع تنہا ہو گئی تھی، اماں جان کی وجہ سے ہمت تھی۔ 1983ء میں جولائی کو مجھے 17 گریڈ مل گیا۔ تھوڑی بہت تنخواہ میں اضافہ ہو گیا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا بچے سکول جانے لگ گئے تھے۔ شمع کا ٹرانسفر کراچی کورنگی "K" ایریا میں ہو گیا اور بچے وہاں جانے لگ گئے۔ توصیف اور عظمی نے اسٹینڈرڈ ہائی اسکول زمان ٹاؤن کورنگی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چھٹی جماعت میں توصیف کا داخلہ کورنگی نمبر '4' میں اپنے اسکول میں کروایا۔ عظمی کورنگی نمبر '6 'D ایریا کی اسکول میں جانے لگی۔ میرے اسکول کا معیار آہستہ آہستہ خراب ہونے لگا تو میرے دوستوں نے کہا کہ توصیف کو کسی پرائیویٹ اسکول میں داخلہ کروادوں۔ کیونکہ کورنگی نمبر ' 4' کا معیار تعلیم خراب ہو گیا ہے۔ بہر حال اس ہی تگ و دو میں ایک، دو سال گزر گئے۔ عظمی اسکول میں آٹھویں 'VIII' کلاس میں چلی گئیں ا۔ س دوران کورنگی لانڈھی کے حالات اور تمام کراچی کے حالات انتہائی خراب ہو گئے۔ MQM کی مار دھاڑ عروج پر تھی۔ لہذا پروگرام بنایا کہ توصیف کو کیڈٹ کالج پٹارو میں داخلہ دلوایا جائے۔ توصیف 9th میں پہنچ چکا تھا لیکن کیڈٹ کالج میں آٹھویں کلاس میں داخل ہوتے تھے۔ لہذا توصیف کا آٹھویں کلاس میں داخل ہو گیا۔ یہ سال 1989ء کا تھا۔ سیماء، تحسین اور تنویر وکٹری اسکول "K" ایریا میں پڑھتے تھے۔ توصیف کی طرف سے بے فکری ہوئی تو، توقیر کی فکر لاحق ہوئی۔ 1992ء میں توقیر کا داخلہ کیڈٹ کالج میں آٹھویں جماعت میں کروایا۔ تنویر اسٹینڈرڈ ہائی سکول زمان ٹاون میں 9th کلاس میں چلا گیا۔ کیوں کہ 1993 میں تنویر کو پٹارو میں داخل کروانا مشکل ہو گیا۔ ایک تو مالی حالات اور اخراجات کا معاملہ تھا دوسرا تنویر کی آنکھ کی چوٹ کا مسئلہ تھا۔ بہر حال تنویر نے قربانی دی اور ہائی سکول میں داخل دل لگایا اور محنت سے میٹرک "A" گریڈ میں کیا اور ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ لے لیا اور اچھے نمبروں سے "A" گریڈ میں انٹر پاس کر لیا۔ تحسین صاحب نے آٹھویں جماعت وکٹری سے پاس کر لیا۔ "XI" میں تحسین کا جب داخلہ آیا دو مسئلے تھے ایک اچھے نمبر اور دوسرے نمبر پر فیس۔ بہر حال کوششیں کر کے پرنس علی بوائز اسکول ملیر میں داخلہ

دلوادیا۔ تحسین نے "B" گریڈ میں میٹرک پاس کیااور خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ دلوایاجائے جو کہ open meritپر نا ممکن تھا۔ بہر حال SMکالج میں داخلہ دلوایا۔ میرے ساتھ اسکول میں کام کرنے والی ٹیچر مسز نور جہاں کے شوہر اطہر صاحب نے کوششیں کر کے بیٹے کو ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ دلوادیا۔ بہر حال تحسین کا داخلہ ڈی جے کالج میں ہو گیا۔ تحسین صاحب نے "C" گریڈ میں انٹر پاس کر لیا۔ 2002ء میں توصیف نے داؤد انجینئرنگ کالج سے "B.E" کر لیااور اسے جلدی نوکری مل گئی۔ توقیر ایک سال آگے تھا لیکن مہران یونیورسٹی میں دونوں کے۔۔۔۔۔ تین چار ماہ کے فرق سے مکمل ہو گئے۔ توقیر اور توصیف نے مہران یونیورسٹی سے کیمیکل میں "B.E" کی ڈگری حاصل کر لی۔ توقیر اور توصیف کو ایک ہی کانووکیشن میں گورنر سندھ عشرت العباد نے ڈگریاں ایوارڈ کیں۔ 14 ستمبر 2013ء بروز اتوار کو والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میں والد صاحب کے کمرے میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھااور سورہ یاسین پڑھ رہا تھا جیسے ہی میں نے سورہ یاسین ختم کی شمع نے آواز ورانڈے سے لگائی جہاں سے والد صاحب کی چارپائی نظر آتی تھی۔ راناصاحب دیکھیں اباجان میں کوئی حرکت نہیں نظر آرہی دوسرے لمحے ہی میں اور شمع اباجان کے سرہانے پہنچ گئے تو دیکھا کہ والد صاحب کی روح فانی جہاں سے کوش کر چکی تھی۔ انتقال سے پندرہ منٹ پہلے کہا کہ بے چینی ہو رہی ہے میں پیشاب کرنا چاہتا ہوں میں نے والد صاحب کو بستر پر پیشاب کا برتن لگایا مگر نہیں آیا والد صاحب نے برتن ہٹانے کو کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اب تو قل اور کلمہ پڑھنا مشکل ہو رہا ہے کیوں کہ وہ تنہائی میں پڑھتے رہتے تھے میں نے کہا جتنا پڑھ سکتے ہیں پڑھیں صرف اللہ اللہ کا ورد کریں مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ میری والد صاحب سے آخری گفتگو ہے۔ اباجان کی عادت تھی کہ سوتے وقت ہاتھ پاؤں سیدھے کر لیا کرتے تھے اور ہمیں اکثر کہا کرتے تھے جب میں سو رہا ہوں تو تم میرے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دینا میں ہنس کر کہا کرتا تھا آپ کو کچھ نہیں ہو گا آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ سارے بچے گھر ہی پر تھے توصیف ماروی آئیل فیلڈ "AMS " کمپنی کے کام سے گیا ہوا تھا۔ وہ پیر کی شام سے پہلے نہیں آسکتا تھا کیوں کہ آمد ورفت جہاز کے ذریعے تھا۔ لہذا والد صاحب کی تدفین کورنگی نمبر "6" میں کر دی گئی ہم بہن بھائی 11 ستمبر 2003ء میں یتیم ہو گئے۔ یہ سب معاملات اللہ کی طرف سے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد توصیف کو جدہ میں ملازمت مل گئی تو توصیف نے "AMS" کو خیر آباد کیا۔ 2004ء میں تحسین نے عثمان انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے "B.E" کمپیوٹر سائنس مکمل کر لیا۔ 21 اگست 2004ء کو میری ریٹائرمنٹ تھی اور شمع کے 25 سال ملازمت کے مکمل ہو گئے تھے۔ تحسین نے ضد کی کہ امی بھی ریٹائرمنٹ لے لیں نہیں تو میں نوکری نہیں کروں گا اور نہ ہی M.sc Telecom میں داخلہ لوں گا۔ بہت سمجھایا کہ دسمبر 2004ء کے فوری بعد ریٹائرمنٹ لے لیں گے ۔ بہر حال بڑی مشکل سے راضی کیا یا شمع کی ریٹائرمنٹ کے لیے ایڈوانس میں درخواست دے دی اور یکم فروری سے شمع نے بھی ملازمت کو خیر آباد کر دیا۔ توصیف "AMS" میں زاہد صاحب کی کمپنی میں ملازمت کر رہا تھا۔ تنویر بھی یونیورسل ٹیزی میں Quality Assurance Engineering کی حیثیت سے ملازمت شروع کی تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ جنوری 2005ء کے دوسرے ہفتے حج تھا۔ 10 دن دسمبر کے اور دن 29 جنوری 2005ء کے سعودیہ میں قیام پذیر رہا۔ توصیف بھی سعودی عرب میں ہی تھا۔ لیکن توصیف کی۔۔۔ پوسٹنگ میں تھی۔ جو کہ مکہ شریف سے تقریبا پندرہ سو کلو میٹر دور تھا۔ مسلہ توصیف کی چھٹی اور کفیل کی اجازت کا تھا۔ کمپنی نے توصیف کو جاپان ٹریننگ کے لیے select منتخب کیا تھا۔ اور 20 جنوری کو جب ان روانگی تھی۔ ٹریننگ پکا چانس تھا۔ لیکن توصیف نے ماں باپ کے ساتھ حج کرنے کو ترجیح دی اور پیسے کمانے کے چانس کو چھوڑ دیا۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ہمیں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ توصیف 7 ذوالحجہ سے 17 ذوالحجہ تک ہمارے ساتھ رہا۔ توصیف کی وجہ سے شمع کو طواف کعبہ، وقوف عرفات، قیام مزدلفہ اور رمی میں کافی سہولت ہوئی۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ہم خیر و عافیت سے اپنے حج کو ادا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آمین۔۔۔ نیا سال 2005ء مبارک رہا۔ 2003ء اور 2004ء بڑا سخت گزرا تھا۔ والد صاحب کا انتقال 14 ستمبر 2003 میں اور 2004ء 21 اگست کو ملازمت

سے ریٹائرمنٹ۔ گھریلو ٹینشن کسی اچھی جگہ پلاٹ کی تلاش۔ بہر حال حج پر جانے سے ایک ہفتہ پہلے اپنی limit میں پلاٹ پسند آ گیا اور ہم نے ٹوکن کر دیا اور دو ماہ کا payment وقت لے لیا۔ سعودیہ سے واپسی کے دو ہفتے بعد ہم نے پلاٹ کا قبضہ لے لیا۔ اب مسئلہ گھر بنانے کا تھا۔ لانڈھی کے گھر فروخت کر کے اور میری پینشن کے پیسوں سے بڑی مشکل سے پلاٹ خریدا تھا۔ شمع کی پنشن کی رقم بھی تھوڑی تھی مکان بنانا مشکل تھا۔ اللہ اللہ کر کے 2007 میں مکان مکمل ہو گیا اور ہم لوگ ڈیفنس ویو سے المسلم شفٹ ہو گئے۔ 27 رمضان المبارک کا دن تھا۔ اٹھائیسویں سحری ہم نے المسلم کے مکان میں کی۔ باقی بچا کچا سامان 28 ویں روزے کو ہم لے آئے تھے۔ میں 27 رمضان المبارک کو صبح سحری کے وقت پیدا ہوا تھا۔ اسلامی لحاظ سے 27 رمضان المبارک بڑا عظیم دن ہے۔ لانڈھی سے ہجرت، نوکری، بچوں کی تعلیم تعلیم اور ان کے ابتدائی ملازمت اور والد صاحب کا بڑھاپا پھر اس کے بعد 14 ستمبر 2003 کو والد صاحب کا انتقال، شمع کا ذہنی دباؤ اور دیگر پریشانیاں وغیرہ وغیرہ۔ ڈیفینس ویو میں پانی کی پریشانی۔ لہذا المسلم کی پہلی میٹھی عید بہت میٹھی گزری۔ اور اللہ تعالی کے فضل و کرم سے زندگی کی بھاگ دوڑ میں ٹھہراؤ آ گیا۔ میں نے بھی ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی کو سکون سے گزارنے کا طریقہ سیکھ لیا۔ المسلم اس لحاظ سے بھی منفرد رہا کہ 1996ء میں عظمی کی شادی کے بعد تمام بچوں کی شادیاں المسلم میں ہی ہوئیں۔

سیماء کے نکاح کی تاریخ 31 مئی 2008ء

توصیف کے نکاح کی تاریخ 8 مئی 2009 ء

تنویر کے نکاح کی تاریخ 21 مارچ 2013ء

تحسین کے نکاح کی تاریخ 6 نومبر 2015ء

2016ء سے تاحال اب یونیورسٹی ہل یو C-159 بلاک نمبر 1 میں تاحال سکون کی زندگی گزار رہے ہیں اور زندگی کا سفر جاری ہے۔

ختم شد

دیوان خانہ اور موٹر خانہ

دیوان خانے لفظ بیٹھک کی جگہ استعمال ہوتا تھا اور موٹر خانہ گیراج کو کہتے تھے۔ جیسا کے میں اپنے مکان کا واقعہ نرمل کا اپنی کہانی سے تفصیل سے بیان کیا تھا۔ مہمان خانہ کافی کشادہ تھا۔ 50 سے 100 فٹ کا ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ سامنے 20 سے 100 فٹ کا ورانڈا تھا۔ اس طرح ایک 14 فٹ اونچا اور 30 فٹ چوڑا اور تقریبا 60 فٹ لمبا موٹر خانہ (گیراج) تھا۔ جس میں بیک وقت دو لڑکے کھڑے ہو سکتے لیکن میں جب چھوٹا تھا تو دیکھا کرتا تھا کہ ایک نئی شیورلیٹ گاڑی اس میں کھڑی رہتی تھی ۔ صبح شام اس کی صفائی ہوتی تھی میں نے اسے چلتے نہیں دیکھا۔ میری دانست میں دو وجہ تھیں۔ ایک تو شہر یا قصبہ کہہ لیں، بہت چھوٹا تھا۔ دوسرے شیورلیٹ گاڑی خریدنے کے بعد عید کے موقع پر والد صاحب نے گاڑی نکالی اور وقت سے پہلے عید گاہ جانے کی ٹھانی۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر روڈ پر جمعدارنی جھاڑو دے رہی تھی، ٹکر ماردی وہ فوراہلاک ہوگئی۔ والد صاحب فوراگھر واپس آگئے دادا صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوراہمارے ماموں صاحب محمد علی خان ایڈوکیٹ صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ انہیں گھر پر رکھیں۔ باہر نکلنے نہ دے میں خود آکر کوتوالی (تھانے) میں پیش کروں گا۔ دادا صاحب چونکہ مشہور ٹھیکیدار تھے۔ ہندو افسران اور مسلمان افسران سب سے تعلق تھا۔ سبھی اظہار ہمدردی کے لیے دادا صاحب کے پاس آرہے تھے۔ مختصر یہ کہ ماموں صاحب نے والد صاحب کو توالی میں پیش کیا اور فوری ضمانت کروا کر گھر لے آئے۔ جمعدارنی کے سرپرستوں کو دیت (خون بہا) دے کر مقدمہ ختم کروایا۔ اس واقعے کے بعد بعد شیورلیٹ گاڑی گیراج کے نظر ہوگئی اور کئی سالوں تک موٹر خانے (گراج) کی زینت بنی رہی اور یہ کہانی بھی اختتام کو پہنچی۔

'بھوجی'

بقول والدہ محترمہ کے میں پیدائش کے وقت شدید بیمار ہو گیا تھا۔ دادا صاحب نے میری دیکھ بھال کے لیے ایک "ہندو خاتون" کو رکھ لیا یا یوں کہیں کہ ایک آیا مقرر کر دی۔ ڈاکٹروں سے علاج ہو رہا تھا مگر کوئی افاقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ حالت بقول والدہ صاحبہ کے "تین سال" رہی۔ 'ماسی بھوجی' نے والدہ صاحبہ سے کہا کہ ایک "گونڈنی" دوائی دیتی ہے۔ آپ کہیں تو میں اسے بلوا لیتی ہوں۔ کیس دادی صاحبہ کے سامنے پیش ہوا، دادی صاحبہ نے ایک طویل انٹرویو کے بعد منظوری دے دی۔ یہاں یہ بتلاتا چلوں کہ "گونڈ" حیدر آباد دکن میں ایک قوم تھی؛ جو زیادہ تر جنگلوں میں رہتی تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ گاؤں اور قصبوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔ بہر حال گونڈنی نے میرا علاج کر دیا اور میں پندرہ بیس دن میں نارمل ہو گیا۔ ہمارے خاندان کی ایک بزرگ خاتون اکثر مجھے پیار سے "گونڈ" کہتی تھیں۔ ہم 1949ء میں پاکستان آ گئے۔ مجھے 1948ء سے پہلے کے واقعات بہت کم یاد تھے اور ہیں۔ ہمیں پاکستان آنے کے بعد معلوم ہوا کہ 'ماسی بھوجی' کو "کوڑہ" کا مرض لاحق ہو گیا اور وہ اپنے گھر پر ہی رہتی ہیں۔ 1955ء دسمبر میں جب حیدر آباد دکن جانے کا اتفاق ہوا تو والدہ صاحبہ نے خصوصی طور پر ماسی بھوجی کو بلوایا اور اس کی دل جوئی کی اور اس کے لیے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ ماسی بھوجی کو اس خطرناک مرض سے شفاء دے اور اس کی مالی مدد بھی کی۔ پاکستان آنے کے کئے سال بعد معلوم ہوا کہ ماسی بھوجی کا (دہانت) انتقال ہو گیا ہے۔

گوپال

حیدر آباد پولیس ایکشن سے قبل دادا صاحب کو ضلع عادل آباد میں ایک بڑا ٹھیکہ پولیس لائنز کا مل گیا تھا۔ وہاں بھی اپنے بچپن کے کچھ دن گزارے۔ پولیس لائنز کے ایک مکان میں ہماری رہائش تھی۔ گھر کے سامنے ایک بہت بڑی گٹھر سی (جھگی) تھی جو اسٹور کا کام کرتی تھی۔ سائٹ کے منشی اور اسٹور کیپر کے فرائض گوپال کے ذمے تھے۔ 'میں' والدہ صاحبہ اور چھوٹی بہن 'پتلی' پولیس لائنز کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ والد صاحب نرمل - نظام آباد اور عادل آباد کے چکر میں رہتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب، دادا صاحب اور چھوٹی پھوپھو کے پاس نرمل میں رہتے تھے۔ گوپال کی ذمہ داریوں میں کسی مزدور کو شہر بھیج کر سودا سلف اور سبزی ترکاری منگوا کر دینا بھی تھا۔ گھر میں واٹر سپلائی کے لائن نہیں لگی تھی۔ تین چار خواتین صبح سویرے آکر پانی بھر کر لاتی تھیں۔ ویسے تو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ایک طرف جنگل اور دوسری طرف پولیس لائن سے ڈیڑھ یا دو کلو میٹر دور شہری آبادی اور بازار وغیرہ تھے۔ میں گھر سے باہر نکل کر شام کے وقت گوپال کی جھگی کی طرف نکل جاتا تھا۔ وہاں گوپال اپنے پاس بٹھا کر پکوڑے کھلاتا لیکن مجھے گھن سی آتی تھی بہر حال میں پکوڑے کھالیتا تھا۔ دو - چار ماہ گزارے، دادا صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ اس جنگل میں رہنا مشکل ہے تو انہوں نے ہمیں نظام آباد بلوالیا اس طرح گوپال کی کہانی بھی ختم ہوئی۔

رام لو

رام لو، دادا صاحب کے پاس ایک ہندو نوجوان لڑکا گھر کا سودا سلف لانے اور دیگر بیرونی کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ بھینسوں کا چارہ لانا بھی اس کی ڈیوٹی تھی۔ بہر حال دادا صاحب کی خدمت کے فرائض رام لو کے ذمے تھے۔ 11 ستمبر 1948ء کے چند دن کے بعد رام لو گ کام چھوڑ کر چلا گیا۔ معلومات کرنے پر انکشاف ہوا کہ رام لو نے کانگریس میں شرکت کر لی ہے اور وہ پکا کانگریسی کارکن بن گیا۔ رام لو کے آنے جانے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن گھر کے فرد کی حیثیت سے اسے گھر کے اندرونی حالات اور ذرائع آمدن اور کاروبار کے متعلق معلومات تھیں۔ لہذا گھر والے ڈرتے تھے ہندو مسلم فسادات کے موقع پر کوئی گڑبڑ نہ کر لے مگر رام لو نمک خور ملازم تھا۔ شہر میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہوتی تو دادا صاحب کو پیشگی کی اطلاع دے دیتا تھا۔ جب بھی کوئی گھر کا فرد پاکستان سے انڈیا دادا صاحب سے ملنے جاتا تو رام لو کو جیسے ہی معلوم ہوتا تو فورا سلام کیلئے حاضر ہوتا تھا۔ جب میں اور والدہ صاحبہ 1955ء میں بھارت گئے رام لو نے حاضری دی۔ چھوٹے ملازم والدہ سے بہت متاثر تھے اور وہ والدہ صاحبہ کی بڑی عزت کرتے تھے اور والدہ صاحبہ بھی حسب توفیق ملازمین کی مدد فرماتی تھیں۔ صرف دادی صاحبہ پرانے ملازمین کے آنے سے خوش نہیں ہوتی تھیں بلکہ پریشان ہوتی تھیں۔ بہر حال ان کی سوچ اپنی جگہ تھی "کافر لا اعتبار"۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اس خوف سے جان چھوٹی۔

مینا

پاکستان آنے کے بعد نوابشاہ منوآباد میں زیادہ عرصہ قیام رہا۔ منوآباد ہمارے گھر کے ارد گرد زیادہ راجستانی لوگ رہتے تھے۔ لوگ زیادہ غریب ہی مگر انکی عورتیں گھر کا کام نہیں کرتی تھیں۔ بھلے، امرود اور بیر فروخت کریں یا چھوٹی موٹی کریانے کی دکان یا پان کا کھوکھا لگانا بہتر خیال کرتی تھیں۔ والدہ صاحبہ محلے کی بچیوں کو شام چار بجے کے وقت قرآن شریف سبیل اللہ پڑھاتی تھیں۔ بچیاں والدہ صاحبہ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی تھیں مگر والدہ صاحبہ سختی سے منع فرمادی تھی، بہر حال والدہ صاحبہ نے مینا کی والدہ سے کہا کہ کسی کام کرنے والی (ماسی) کا بندوبست کرو۔ اس کی والدہ نے کہا اپنے محلے میں تو ناممکن ہے۔ بہر حال میری بیٹی صبح آکر آپ کا ہاتھ بٹادے گی۔ والدہ صاحبہ نے اس بات کو قبول کرلیا اور محلے میں کسی سے ذکر نہ کرنے کی درخواست کی۔ ہمارے گھر میں جگہ تو کافی تھی۔ مرغیاں پال لیں۔ آہستہ آہستہ مرغیاں تو ختم ہو گئیں۔ ایک مرغا بچ گیا۔ مرغا بڑا لڑاکو تھا۔ جب گھر سے باہر جاتا لہولہان ہو کر آتا تھا۔ مختصر ایہ کہ لڑائی میں اس کی آنکھیں بھی ضائع ہو گئیں۔ بہر حال وہ گھر کی چوکیداری خوب کرتا تھا۔ گھر میں کوئی نیا آدمی آئے تو آنکھوں سے اوجھل ہو کر حملہ کرتا تھا محلے کے بچے تو دروازے سے اندر داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے بلکہ مرد خواتین کو بھی پریشانی ہوتی تھی جب تک گھر کا فرد آواز لگا کر نہیں کہتا کہ مت کرو مہمان ہیں تب تلک وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیتا تھا لہذا جب مینا صبح آتی تو آواز لگاتی اور والدہ صاحبہ مرغے کو منع کرتی تو وہ بیچاری گھر میں آکر والدہ صاحبہ کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور جاڑو برتن اور صفائی کا کام کر کے چلی جاتی۔ ڈیڑھ سال کے بعد مینا کی شادی ہو گئی والدہ صاحبہ کو پھر مشکل پیش آنے لگی۔

غفوری

نواب شاہ میں ہمارے گھر سے دو تین فرلانگ پر بجلی کا پاور ہاؤس تھا۔ پاور ہاوس سے دو گلی پہلے روڈ پر ایک بڑی بی جس کا نام غفوری تھا آتے جاتے والدہ صاحبہ سے دعا سلام ہوتی تھیں والدہ صاحبہ اکثر اس کی تیمار داری کرتی تھی کبھی دوا دلوادی کبھی بازار سے دوائی منگوا کے دی۔ والد صاحبہ نے غفوری صاحبہ سے کام کرنے والی ماسی کا کہا وہاں بھی مسئلہ یہ تھا کہ راجستانی غریب عورتیں گھریلو کام کاج نہیں کرتی تھی۔ جب کوئی بندوبست نہیں ہوا تو بڑی بی نے اپنی خدمات پیش کر دی۔ وہ سال ڈیڑھ سال کام کرتی رہی اس کے بعد وہ بیمار ہو گئی۔ وہ اپنے گھر پر ہی چارپائی پر لیٹی رہتی تھیں۔ والدہ صاحبہ اکثر اس کے پاس دلجوئی اور دوائی وغیرہ دلوانے جاتی تھی۔ سال کے بعد تو ہم نے انڈیا جانے کا پروگرام بنالیا تھا انڈیا سے واپس آ کے ہم نواب شاہ نہیں گئے۔ اس طرح ایک اور دور مکمل ہوا۔

بڑی بی

1965ء کے ادوار میں والدہ سے وہ پر کام کا بڑا دباؤ تھا۔ تقریبا40افراد کا ناشتہ دوپہر کا کھانا شام کا کھانا والدہ صاحبہ بھی پریشان رہتی تھی۔ ماسی کا بندوبست کرتی تھی تو وہ ہفتہ دو ہفتہ کام کر کے چھٹی کر لیتی تھیں۔ کوئی مستقل ماسی کا بندوبست نہیں ہو پا رہا تھا۔ بہر حال وقت گزر رہا تھا۔ ایک ضعیف بوڑھی خاتون نے گھر میں کام کرنا شروع کیا۔ بڑی بی نے والدہ صاحبہ کو کہا کہ جتنا ہو سکے گا کام کرو گی۔ والدہ صاحبہ بڑی بی کا بہت خیال کرتی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتی تھی تو والدہ صاحبہ ان کو چائے پیش کرتی تھیں۔ بڑی بی بھی سلیقہ مند تھی وہ گھر میں داخل ہو کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی تھی اور والدہ صاحبہ انہیں سبزی بنانے کو دے دی تھی اور آٹا گودنے کا سامان ان کے حوالے کر دیتی تھی اور آخر میں برتن وغیرہ کی صفائی اور گھر کی صفائی کرتی تھی۔ والد صاحب والدہ پر بہت غصہ کرتے تھے۔ بڑے بی کونے بیٹھی کام کرتی رہتی تھی بعض دفعہ وہ بول اٹھتی تھی. "میاں بس کرو۔ اتنا غصہ نہیں کرتے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے" والد صاحب کا غصہ یک دم ختم ہو جاتا تھا اور بڑے کے احترام میں خاموش ہو جاتے تھے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ والد صاحب نے بڑی بی کی نصیحت کا برا منایا ہو اور کوئی جواب دیا ہو۔ بڑی بی بی آٹھ سے دس سال ہمارے یہاں کام کرتی رہیں پھر شدید علیل ہو گئی۔ والدہ صاحبہ ان کی تیمارداری میں مالی معاونت کرتی تھیں۔ زندگی نے وفا نہیں کی اور ایک دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

حرام خور

میری والدہ محترمہ کی چار بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ جن میں سے تین کی ابتدائی پرائمری تعلیم ایک ہی مدرسے سے حاصل کی اور ناظرہ قرآن مجید بھی ایک استاد سے پڑھا۔ مولوی صاحب جن کا تعلق بھی ہریانہ سابقہ پنجاب سے تھا گھومتے پھرتے حیدر آباد دکن آ گئے۔ وہاں راجپوت برادری نے 'بزرگ' کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بس حیدر آباد دکن ضلع نظام آباد میں آباد ہو گئے۔ نظام آباد دکن میں راجپوت برادری کے چالیس پچاس گھر تھے اور راجپوت قائم خانی راجپوتوں کے گھر تھے اور ایک دو گھر ہریانہ کے علاقے کے۔ گڈیانی کے پٹھان ٹھیکیداروں کے سب کی بیٹھک ایک ہی جگہ ہوتی ہمارے دادا شفی محمد خان ولد عبدالغنی خان صاحب زیادہ سوشل تھے لہذا زیادہ بیٹھک دادا صاحب کے دیوان خانے پر ہی ہوتی۔ عصر کے بعد سب برادری اور دیگر جاننے والے ایک جگہ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کرتے تھے ہم یوں کہہ سکتے ہیں گپ شپ لگاتے تھے۔ سرور خان صاحب پٹھان کی بیٹی رابعہ خالہ تھیں۔ خان صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ رابعہ خالہ میری والدہ کی اچھی سہیلی تھیں۔ دوسرے نمبر پر ہمارے پھوپھا حافظ نیاز محمد خان صاحب کی بہن بلقیس خالہ تھیں۔ خیر سے ان کے شوہر عبدالحفیظ خان صاحب جو کہ قائم خانی راجپوت تھے۔ تیسرے نمبر پر میری والدہ صاحبہ کی تایازاد بہن بشیر ابوا خالہ تھیں جو ہمارے ماموں کی اکلوتی بہن تھیں۔ اسی طرح والدہ صاحبہ بھی اللہ بخش خان نانا جان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ والدہ صاحبہ 9 سال کی عمر میں اپنی والدہ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئی تھیں۔ والدہ صاحبہ کی تائی دادی جنت والدہ صاحبہ کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ اسی طرح دو بھائیوں جان محمد صاحب، نانا اللہ بخش صاحب کی ایک ایک بیٹی تھی۔ والدہ کے دو بھائیوں کی ایک بہن اور بشیر ابوا خالہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ والدہ صاحبہ ہمہ وقت اپنی تائی جنت اور تایازاد بہن بشیرا کے ساتھ گزارتی تھیں۔ قدرتی طور پر دونوں بھائیوں کی اولاد میں بھی خلوص اور محبت تھی۔ جو کہ زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ مرتے دم تک قائم رہی۔ سرور خان صاحب کی زوجہ ۔۔۔۔۔۔ رابعہ خالہ کی والدہ سے بے پناہ پیار کرتی تھیں اور والدہ صاحبہ کا بڑا خیال رکھتیں تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد وہاں بہادر کراچی اور ماڈل کالونی میں رہتے ہوئے والدہ صاحبہ کو بلوا لیا کرتی تھیں۔ بلقیس خالہ کی بہنیں تھیں اور ہمارے پھوپھا حافظ نیاز محمد خان ان کے اکلوتے بھائی تھے (تین بہنوں کے نام حاجرہ، بلقیس اور اختری تھے)۔ جن میں سے بلقیس خالہ سے گہری دوستی تھی۔ چوتھے نمبر سے آسمہ خالہ تھیں۔ آسمہ خالہ والدہ صاحبہ کی تایازاد بہن تھیں اور نانگل گاؤں میں نانا بو علی بخش ہی رہتے تھے دوسرے دونوں بھائی دکن میں رہتے تھے لہذا گاؤں میں صرف ایک تایازاد بہن ہی ان کی سہیلی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہے پاکستان میں 1949ء میں ہجرت کے بعد جب ہم نے جیل روڈ حیدر آباد کالونی کے قریب اسلام آباد کی کچی آبادی میں قیام کیا وہاں پانی کی شدید قلت تھی۔ والدہ صاحبہ کپڑے دھونے، نہانے اور ملاقات کے لئے بلقیس خالہ کے گھر جاتی تھیں۔ جناب عزیز خان صاحب خالو کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا اور انکی کئی بسیں تھیں۔ ان کے چار بیٹے تھے وحید، نعیم، سلیم اور حمید۔ وحید بھائی بڑے شفیق تھے بڑے پیار سے بات کرتے تھے۔ مجھے منو کہہ کر بلاتے تھے۔ منو اپنے سے کم عمروں کے لیے احترام اور پیار کا لفظ ہے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ والدہ صاحبہ والدہ ان کو گھر میں صبح شام ہو جاتی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد والدہ صاحبہ کو بلانے جاتا۔ وہ دوپہر کے کھانے پر اسرار کرتی تھی میں دروازے کی طرف دوڑ لگاتا اور کہتا تھا میں کھانا کھا کر آیا ہوں ۔ وہ پیار سے کہتی تھی حرام خور جھوٹ مت بولنا کھانا کھا کر جانا۔ حرام خور ایک طرف سے ان کا تکیہ کلام تھا۔ یہ تکیہ کلام وہ پیار میں اور شاید اپنی اولاد کے ساتھ غصے میں بھی استعمال کرتی تھی۔ اس ہی طرح ہماری خالہ بشیرا (بوا) بھی پیار محبت اور غصے میں لفظ حرام خور استعمال کرتی تھی۔ کبھی کبھی میرے سسر ابراہیم ماموں محبت اور غصے میں لفظ حرام خور استعمال کرتے تھے جس سے ایک اپنائیت اور محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ بات تب کی ہے کہ میرے سسر صاحب نے کبھی اپنی اولاد کے علاوہ دوسروں بچوں کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ اسی طرح رابعہ خالہ دختر سرور خان نانا کے گھر بہادر آباد میں آنا جانا رہتا تھا۔ رابعہ

خالہ انتہائی نفیس خاتون تھیں اوران میں بڑا رکھ رکھاو تھا۔ والدہ کی تین سہیلیاں (ہماری خالائیں) تو برادری سے تعلق رکھتی تھی۔ جن سے کہیں نہ کہیں واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن رابعہ خالہ سے خصوصی تعلق تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج سو سال ہونے کو آرہے ہیں ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد سے ہمارے تعلقات قائم اور وہی احترام محبت اور خلوص قائم ہے۔ جس پر مجھے میری بیوی 'شمع' کو اور میرے اولاد کو فخر ہے۔ ہمارے گاؤں والی خالہ آئمہ پارٹیشن کے بعد اپنے شوہر شمشیر خان صاحب نانگانے والوں کے ساتھ کراچی آ گئے۔ جب ہم پاکستان آئے تو وہ پاکستان میں لیفٹیننٹ تھے کیونکہ وہ بچہ فورس برٹش نیوی میں بھرتی ہوئے تھے اور لیفٹیننٹ کمانڈر ریٹائر ہوئے۔ 1952ء سے لے کر 1965ء بڑے گہرے تعلقات رہے۔ ہم منوڑہ کیماڑی بہادر آباد وغیرہ ان کے گھر ملاقات کے لیے جاتے تھے کمانڈر شمشیر خالو والدہ صاحبہ کا بڑا احترام رکھتے تھے وہ اکثر چھٹی تک لینے آتے تھے اور واپسی میں خود نفیس بہ نفیس خداحافظ کرنے آئے تھے۔ 1960ء میں دادا صاحب جیٹی تک پاکستان تشریف لے آئے۔ وہ ہر ایک دو ماہ بعد دادا صاحب سے ملتے معہ فیملی لانڈھی ضرور آتے تھے۔ 1970ء کے بعد ریٹائر ہو گئے اور انہوں شمس قاضی جہاز کے کمانڈر سنبھالی (پرائیوٹ شپ) وہ سمندر کے پانیوں پر سفر کرنے لگے اور مصروفیت بڑھ گئی علاوہ اس کے والد صاحب وغیرہ بھی بوڑھے ہو گئے اور دادا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اسی عرصے میں ہماری خالہ ائمہ کا بھی کینڈا میں انتقال ہو گیا۔ والدہ صاحب بھی انتہا کمزور ہو گئے۔ جب ملنے والی تایازاد بہن اور گاؤں کی سہیلی ہی نہ رہی۔ تو ملنا ملانا کم ہو گیا۔ ملاقات صرف شادی اور تقاریب تک محدود ہو گئی۔ 2002ء میں تب ہم ڈیفنس ویو میں تھے۔ دو ایک دفعہ ملاقات کے لیے گیا مگر وہ اپنے ہوش میں نہیں تھے تو میں کیا ملاقات کرتا ان کی بیٹی سے خیر خیریت معلوم کر کے آ گیا۔ ملنا ملانا نہ صحت زندگی کے ساتھ ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ جب کبھی ماضی کی بات ہوتی ہے تو مجھے یہ یہ فقراء "حرام خور" بہت یاد آتا ہے۔

چھتر

میرے دوست اور اسٹاف ممبر شفیع محمد غوری صاحب جو کہ میرے سینئر ساتھی سیاست میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ روز شام کو میرے گھر آجاتے اور گپ شپ ہوتی تھی۔ یہ تعلق تقریباً 30 سال رہا اور ان کے انتقال پر ختم ہوا۔ والد صاحب پرانے مسلم لیگی تھے، غوری صاحب میرے کم والد صاحب کے گہرے دوست ہو گئے۔ غوری صاحب نے ہجرت کے بعد شہداد کوٹ میں مقیم ہو گئے۔ شہداد کوٹ سے میٹرک اور میٹرک کے بعد حالات کی وجہ سے نوکری کرلی۔ سوئے قسمت بلوچستان میں نوکری ملی۔ وہ جونیئر کلرک بن کر بلوچستان چلے گئے۔ انہوں نے وہاں نوکری کے دوران انٹر - B.A اور گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ کالج لاہور سے B.T کیا اور ہائی اسکول ٹیچر بن گئے۔ بلوچستان کے دور افتادہ علاقوں میں تبدیلیاں posting ہوتی رہتی تھیں۔ غوری صاحب پڑھنے پڑھانے والے شخص تھے۔ بلوچستان کے دیہی علاقوں میں رہتے ہوئے آپ نے علاقائی شاعروں اور علاقائی زبانوں کے متعلق مطالعہ کیا اور علاقائی تاریخ پر توجہ دی۔ بہر حال 1972ء میں سندھ ڈومیسائل ہونے کی وجہ سے Repeater ہو کر ہو کر سندھ واپس آگئے۔ انہوں 1972ء کو کراچی میں پوسٹنگ ملی۔ میں اور غوری صاحب 1996 تک ایک ہی اسکول میں کام کرتے رہے۔ ہمارے اسکول کا نام گورنمنٹ بوائز سیکنڈری نمبر 1 کورنگی نمبر 4 تھا۔ اس کا شمار کراچی کے چند اچھے سرکاری اسکولوں میں ہوتا تھا۔ اسکول نے متعدد طلباء کرکٹ کے اچھے کھلاڑی پیدا کیے۔ کئی ایم پی اے - ایم این پروفیسر اسکول کے طالبعلم رہ چکے ہیں۔ اسلم مجاہد، جسٹس قاضی خالد، پروفیسر اسحاق مدنی اور نعیم اختر ایم پی اے کا تعلق اسی اسکول سے تھا۔ جناب غوری صاحب اکثر ورکنگ کلاس کے انداز کا انٹرویو کیا کرتے تھے۔ انہیں اردو، سندھی، پنجابی، بلوچی، ریاستی اور دیگر زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے بہت سے شاگردوں نے ان کے تعاون سے ایم اے سندھی اور ایم اے اردو کے امتحانات پاس کیے۔ وہ عوامی رجحان کا اندازہ لگانے کے لیے سامنے والے شخص سے اس کی اپنی مقامی مادری زبان میں بات چیت اور سوال و جواب کرتے۔ وہ اکثر مزدوروں سے ان کی دلی بات قبول کروانے کے لیے اکثر ایک سوال کیا کرتے تھے۔ اگر تمہیں دس لاکھ روپے کے انعامی بانڈ یا لاٹری کی صورت میں مل جائے تو تم کیا کرو گے (ستر کی دہائی میں دس لاکھ روپے کی بڑی اہمیت تھی)۔ پہلے تو بندہ اپنی کم نصیبی کا رونا روتا لیکن غوری صاحب باتوں کے فن سے اس کی دلی بات قبول کروا لیتے تھے وہ بیچارہ ہاری یا مزدور کہتا کہ مجھے دس لاکھ روپے مل گئے تو میں زمین خریدونگا۔ غوری صاحب مزدور کی حوصلہ افزائی کرتے اور کہتے، بہت اچھا خیال ہے۔ کیا! تم اپنی زمین خود کاشت کرو گے۔ وہ جواب میں کہتا۔ ناجی - نا میں کاشت کرواؤں گا۔ غوری صاحب مزدور یا ہاری سے کہتے تم جس ہاری سے کام کرواؤ گے، کام نہیں کرے گا تو وہ فوراً ترخ کر جواب دیتا کہ میں اسے چھتر لگاؤں گا۔ غوری صاحب کہتے ابھی تک تو تم چھتر کھا رہے ہو اب چھتر لگانے کا ارادہ ہے۔ پھر اسے پیار سے کہتے بھائی چائے پیو اللہ خیر کرے گا۔ مختصر ایہ کہ پاکستان کی ایک وسیع آبادی جو غربت کی سطح سے نیچے ہے۔ شہری آبادی میں مل مزدور "مل مالک" اور قصبہ دیہات میں کاشتکار اور ہاری "زمیندار/چودھری" بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں صرف "چھتر" ہے۔ یا تو کھاتا ہے یا موقع ملنے پر مارنا چاہتا ہے۔

یہ 'چھتر' بھی عجیب 'شے' ہے۔

کراچی کا مسئلہ

1955ء کو میرا نوابشاہ سے کراچی آنا ہوا۔ 1955ء سے 2020ء تک شب و روز میرے سامنے ہے۔ ایوب خان کے دور میں اعظم خان صاحب کے بعد مہاجرین کی آبادکاری کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ایوب خان صاحب کے دور میں میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا۔ اس وقت صرف لانڈھی کا علاقہ کارخانوں کا گڑھ تھا۔ سندھی بھائی تو کارخانوں میں کم کام کرتے تھے اور کم کم کراچی کا رخ کرتے تھے۔ کارخانوں میں زیادہ تر مزدور پنجاب سے آتے تھے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ 1958ء کے بعد سندھ کے باہر سے آنے والی لیبر نے مل ایریا میں قریب کی خالی زمینوں پر ناجائز تعمیرات شروع کر دی، کیوں کہ مارچ 1953ء کھوکھراپار کی سرحد بند کر دی گئی تھی۔ 1958ء کے بعد انڈسٹریز بنانا شروع ہوئی اور کچھ کچھ کنسٹرکشن ہونا شروع ہوئی۔ پٹھان لیبر اور اور ٹھیکیداروں نے کراچی کا رخ کیا۔ پہلے پختون لیبر کھدائی کا کام کرتی تھی اور آج تک کراچی میں انہیں کا دور دورہ ہے۔ پہلے تعمیراتی کام اور ٹیکنکل کام میں وسطی پنجاب سے لوگ آتے تھے اور اب موجودہ دور میں جنوبی پنجاب سے آتے ہیں۔ مہاجرین کی آبادکاری کا سلسلہ 1958ء کے بعد تقریبا موقوف ہو چکا تھا۔ صوبہ سرحد سے آنے والے افراد نے خالی زمین پر قبضہ شروع کیا۔ جس کی بڑی مثال بڑی بڑی کچی آبادیاں قائد آباد، بنارس، شیر شاہ، کیماڑی، پہلوان گوٹھ، فرنیئر کالونی، نیلم کالونی، کلفٹن اور ڈیفنس کے اطراف میں کشمور کالونی، ڈالمیا، اورنگی کے کچھ علاقے ہجرت کالونی، کٹی پہاڑی، سہراب گوٹھ، شیر پاؤ، گیدڑ کالونی۔ منوڑا، پرانی سبزی منڈی، مجاہد کالونی، ہجرت کالونی۔ ہسپتال چورنگی، پنجاب چورنگی میں کھپت ہونے لگی۔ صوبہ سرحد میں صنعتی اسٹیٹ بنالی گئی مگر غیر ہنر مند لیبر کا مسئلہ باقی رہا۔ دوسرا سرداری سسٹم کی وجہ سے غیر ہنر مند پختون لیبر کا رخ کم و پیش کراچی ہی کی طرف رہا اور بلوچستان کا مسئلہ اپنی جگہ ہے۔ وہاں انڈسٹریز نہیں لگائی گئیں۔ کراچی کے منسلکہ علاقوں حب وغیرہ میں کارخانے لگے اور وہ اب بھی سرداروں کے مرہون منت ہیں۔ ہر فیکٹری آج کے ترقی یافتہ دور میں سرداروں کو یا وہاں کے زور آور لوگوں کو بھتہ دیتے ہیں۔ اگر وہ بھتی نہیں دیں تو وہ فیکٹریاں کام نہیں کر سکتیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس کا علم پاکستان کے ہر خاص و عام کو ہے اور لوگوں کو یہاں تک معلوم ہے کہ کون سی فیکٹری کس شخص کو کتنا بھتہ دیتی ہے۔ اب آجائیں اندرون سندھ کے حالات، وہاں کے دانشوروں نے تعلیم پر کافی لوگوں کو راغب کیا اور انہوں نے چھوٹے شہروں قصبوں کے افراد کو جیسے تیسے ڈگریاں دیکر سرکاری محکموں میں ملازمت کے مواقع فراہم کیے۔ بھٹو صاحب نے کوٹہ سسٹم کا تحفہ دیا تھا اور کہا یہ گیا تھا کہ یہ سسٹم دس سال کے لئے ہے مگر 48 سال سے قائم ہے۔ آنے والے سال میں سلور جوبلی ہو جائے گی۔ پہلے نوکریاں سیاسی اور علاقے کی مناسبت سے پوری کی جانے لگی۔ اس کے بعد سرکاری ملازمتوں کی خرید و فروخت ہونے لگیں۔ اب تو ملازمتیں آکشن کے انداز میں دی جانے لگی ہیں۔ اب تو ایک پرائمری اسکول ٹیچر اور عام سپاہی کی ملازمت حاصل کرنے کے لئے دو لاکھ روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ کراچی میں 1980ء تا 1985ء کے عرصے میں مہاجر نوجوانوں کو نفرت کی تعلیم دے کر اور سرکاری ملازمتوں سے دور رکھا گیا۔ اس کے بعد ان کو اخلاقی گراوٹ کے ایسے سبق پڑھائے گئے اور ان کی برین واش کر کے انھیں چور، ڈکیت اور کرمنل بنا دیا گیا۔ تمام اخلاقی قدروں کو ملیامیٹ کر دیا گیا۔ جو لوگ تعلیم یافتہ اصول پرست ایماندار گردانے جاتے تھے۔ اب نکمے چور اور معتصب قرار دیے جا رہے ہیں۔ مہاجروں کو ایک انمول تحفہ دیا گیا، اب پچاس سال تک یہ طبقہ حالات کو نہیں بحال کر سکتا۔ کراچی کے گردنواح میں گوٹھوں میں بسنے والے لوگ انتہائی پرامن اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ اندرون سندھ سے آنے والے افراد نے انہیں معتصب بنا دیا اور رہا سا کام کراچی کے راندے درگاہ کے لوگوں نے پورا کر دیا۔ دوسرا ظلم یہ ہوا لسانی تعصب کے بعد چھوٹا موٹا کام کرنے والے اور دیہاڑی والے لوگوں میں سے کچھ کو تو لسانی فسادات میں نقل مکانی پر مجبور کیا اور کچھ کو بھائی لوگوں نے لولی پوپ دیا۔ قہ لوگ اندرون سے کراچی کا رخ کرنے لگے۔ جس پر انہیں گندے نالوں اور پارک اور دیگر سرکاری زمین چائنا کٹنگ کر کے آباد کیا گیا اور

سیاسی مخاصمت کے بعد اور نیا دور شروع ہوا۔ سیاسی کارندوں، وڈیروں اور نظم و نسق کے ٹھیکیداروں نے ایک مثلث بنالی اور کراچی کے عوام کو لوٹنا شروع کر دیا۔ دس فیصد حصہ کراچی کے ٹھیکیداروں نے بھی ڈال دیا۔ اور کراچی کے کاروباری اشخاص کو راضی خوشی یا زبردستی اپنا پارٹنر بنالیا اور پیسہ لگائے بغیر شراکت دار بن گئے اور دولت کی ہوس میں کراچی کو تاراج کر دیا۔ اب بھی اندرون سے کراچی کا رخ کرنے والوں کی پہلی ترجیح سرکاری نوکری اور ایسی جاب ہے، جہاں سے تنخواہ کے علاوہ نوٹ چھاپے جا سکیں۔ اب تو ہر سرکاری ملازم کی اتنی پراپرٹیز (properties) ہے کہ اگر اس گریٹ کے فرد کی تنخواہ کا حساب لگایا جائے تو آپ دانتوں میں انگلیاں دبالیں گے۔ کراچی میں اندرون سندھ سے آئے ملازم صرف پیر سے جمعرات تک دفتر میں حاضری دیتے ہیں۔ جمعرات کو شام دو گھنٹے پہلے مجھے آفس چھوڑ دیتے ہیں اور پیر کو دو گھنٹے دیر سے آفس تشریف لاتے ہیں۔ کراچی کے گرد و نواح میں اندرون شہر گوٹھ آباد اسکیم کے تحت قیمتی زمینوں پر کچی آبادیاں قائم کر لی گئی ہیں۔ اسکیم 33 میں سینکڑوں سوسائٹیوں اور سرکاری قطع اراضی پر گوٹھ یا سوسائٹیاں قائم کر لی ہیں۔ ایئرپورٹ کے گرد بھٹائی آباد، بے نظیر آباد، بختاور بلاول بھٹو کے نام سے اور پرانے گوٹھوں کے اطراف تجاوزات کر کے آبادیاں قائم کر لی گئی ہیں۔ شہر کے اطراف میں بے نظیر بھٹو غازی گوٹھ، بلاول بھٹو شاہ لطیف ٹاؤن اور گلشن حدید سے لے کر حب ریور روڈ اور لیاری سے لیکر سپر ہائی وے تک بے شمار گوٹھ اور سوسائٹیاں قائم کر لی گئی ہیں۔ ان قبضہ شدہ زمین پر قائم ناجائز تعمیرات پر مالکان سندھی اور پٹھان ہیں۔ اور مہاجر، سرائیکی، پنجابی، بہاری، پوٹھوہاری اور افغانی کرایہ دار ہیں۔ سچل جیسی بڑی بڑی سوسائٹیاں، گوٹھ کے نام پر قائم کر لی گئی۔ اس میں حصہ کچھ مہاجرین نے بھی ڈالا ہے۔ گجر نالے کے کنارے پر آبادیاں قائم کر لی۔ 40 فٹ کا 'نالہ' 14 فٹ تک رہ گیا۔ 800 فٹ کی لیاری ندی 40 فٹ کی رہ گئی۔ اس سے عام مہاجر کو کم فائدہ پہنچا۔ عوام کے کرتا دھرتاؤں نے مال بنایا۔ ایک اور ظلم یہ ہے کہ کراچی کی 55 سے 60 فیصد زمین کنٹونمنٹ بورڈ کی تحویل میں ہے۔ کراچی کے اصل باشندوں کو جھگی یا دس دس منزلہ عقوبت خانوں میں جائے عافیت ملی۔ جب تک ملک میں سماجی انصاف عوام کو نہیں ملے گا تو وڈیروں کے کمداروں، زور آور لوگوں کے گماشتوں اور سرداروں اور So-called بھائیوں سے جب تک جان نہیں چھوٹے گی۔ کراچی یوں ہی برباد رہے گا۔ مہاجرین 1947 سے 1957 میں یا یوں کہہ لیں 1960ء تک آباد ہو گئے تھے۔ اصلی مہاجرین تو ڈرائیور اور چپڑاسی۔ خانساماں۔ دھوبی اور کریانہ مرچٹلا کی دکان تک محدود ہو گئے۔ جو پڑھ لکھ لیے انہوں نے بیرون ملک کینیڈا، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کا رخ کیا اور وہیں کے ہو گئے۔ کسی نے گرین کارڈ حاصل کر لیا۔ کسی نے امیگریشن اور کسی نے اقامہ۔ مہاجر ابھی تک مہاجر ہی ہیں۔ اپنے وطن اور اپنے شہر میں حالات کے پیش نظر ہجرت کی۔ کسی نے ایک شہر سے روزگار اور تعلیم کے خاطر ہجرت کی، کسی نے اپنی جان مال عزت آبرو اور سکھ اور سکون ایک علاقے سے دوسرے چلے گئے۔ تبدیلی سرکار نے بھی مہاجرین کی بربادی میں اپنا حصہ ڈال دیا۔ کوٹہ سسٹم کو غیر معینہ مدت (لامحدود عرصے) تک رہنے کی منظوری دے دی۔ مہاجرین کو بحیرہ عرب کا راستہ دکھا دیا۔ اللہ خیر کرے۔ اس ذہنی اذیت اور لاوارثی کے عذاب سے کب جان چھوٹے گی۔ محسوس ہوتا ہے بحیرہ عرب ہی اس قوم کا مقدر ہو گا۔

گورڈن کالج راولپنڈی کا "دادا"

میں ماہ مئی 2020 کے covid-19 کے لاک ڈاؤن کے دوران ایک ٹی وی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ جس میں جناب شیخ رشید صاحب معروف عام "شیدا ٹلی" بڑے فخر سے فرما رہے تھے کہ میں اپنے تعلیمی ایام میں گورڈن کالج راولپنڈی کا دادا تھا، یہ سن کر میں اپنی جوانی کے دور میں پہنچ گیا۔ ایک سابقہ ٹیچر ہونے کی حیثیت سے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ کالج و محلے کے دادا لوگ انتہائی بزدل اور موقع پرست ہوتے ہیں۔ چند بزدلوں اور نکموں کا ایک ٹولہ بنا کر شریف اور طاقتور افراد کو چالاکی سے تنہا پا کر حملہ کرتے ہیں اور اپنا جھوٹا رعب و دبدبہ دکھاتے ہیں۔ اس ضمن میں اپنی زندگی کے واقعات کا احاطہ کر کے داداوں کی ایک سیریل لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ زندگی میں چھوٹے موٹے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں، مگر یہ میری دانست میں 1962ء یا 1963ء کا واقعہ ہے۔ جب میں پاکستان نیول ڈاکیارڈ میں اپرنٹس تھا۔ میرے بیچ کا ساتھی "راشد" جو الیکٹرک ورکشاپ میں تھا۔ لنچ کے آغاز میں اپنے دوستوں سے ملنے MED شاپ جایا کرتا تھا۔ میں MCD پلیٹر شاپ میں اپرنٹس تھا۔ MED ورکشاپ میں ایک شخص جس کا نام 'ریاض' اور عرفیت 'پہلوان' تھی وہاں کے اپرنٹسوں کو بلاوجہ پریشان کرتا تھا۔ وہ اپنے حصے کا کام وہاں کے اپرنٹسوں سے کرواتا تھا اور دھونس دھمکی سے پریشان کرتا تھا اور وقت بے وقت 'چائے پانی اور خرچہ پانی' کا مطالبہ کرتا تھا۔ اپنے آپ کو پنجابی باڈی بلڈنگ کلب کا ممبر جتلاتا تھا اور 1962- 1963 کے دور میں کھارادر کے 'پنجابی باڈی بلڈنگ کلب' کی گنڈا گردی سے علاقے کے لوگ بھی پریشان تھے اور کلب کی گنڈا گردی کافی مشہور تھی۔ بہر حال ایک دن راشد میرے پاس آیا اور کئی اپرنٹس لنچ بریک میں جمع تھے اور گپ شپ ہو رہی تھی آتے ہی راشد نے ریاض پہلوان کی چیرہ دستی بیان کی۔ میں نے اپنے ساتھی اپرنٹسوں سے کہا کہ اب موقع ہے ریاض پہلوان سے نمٹ لیتے ہیں، تھوڑی ہمت کرو بھاگنا نہیں، باقی میں نمٹ لوں گا۔ ہم ریاض پہلوان کے پاس پہنچے اور راشد کو پریشان کرنے کی وجہ دریافت کی۔ پہلوان نے آنکھیں نکال لی اور کہا تم جانتے نہیں میں کھارادر کا دادا ہوں۔ میں نے ورکشاپ میں سے ایک اسٹیل کا پائپ اٹھایا اور پہلوان کی طرف لپکا اور زور زور سے چیخنا شروع کیا۔ ورکشاپ میں شور شرابے سے تمام ورکر جمع ہو گئے۔ میں نے ریاض پہلوان سے کہا آج تیری دادا گیری کا آخری دن ہے۔ ساتھی اپرنٹسوں نے بھی چڑھائی کر دی اور کہا کہ تجھے اور تیرے کھارادر کلب کو دیکھتے ہیں۔ ورکشاپ میں سو ڈیڑھ سو افراد کام کرتے تھے۔ سب نے ملامت کی۔ فورمین مسٹر سائمن بھی دوڑ کر آ گئے۔ لوگوں نے (ورکروں) نے بڑی مشکل سے ریاض کی جان چھڑائی۔ نیوی کا مسئلہ تھا افسران کو پتہ چلتا تو ریاض کی نوکری جاتی اور دیگر محکمانہ کارروائی ہوتی۔ اپرنٹسوں کو تو صرف ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی۔ بہر حال ریاض نے ادارے سے باہر اور کھارادر میں ٹکرانے کی کوشش کی مگر اپرنٹسوں نے اس کا بھرم ختم کر دیا تھا لہذا اس کی بدمعاشی نہ چل سکی۔ شریف لوگوں کی جان چھوٹ گئی اور ایک دادا گیر کی دادا گیری ختم ہو گئی۔

ڈی جے سائنس کالج کا "دادا"

اسٹوڈنٹ لیڈر شہنشاہ حسین جو کہ پہلے 'ڈی جے کالج' کا طالب علم تھا، بعد میں NED انجینئرنگ کالج میں سول انجینئرنگ کا طالب علم تھا. ایک ٹولہ کی صورت میں برنس روڈ پر جامع کلاتھ مارکیٹ کے علاقے میں دھما چوکڑی مچاتا اور گنڈا گردی کرتا تھا اور اپنے آپ کو سٹوڈنٹ لیڈر کہلواتا تھا۔ شومئ قسمت ایک دن وہ دس بارہ لڑکوں کے ساتھ گروپ کی شکل میں لانڈھی نمبر 89 میں بس کے اسٹاپ ایمپریس مارکیٹ آیا اور ہماری بس میں سوار ہو گیا۔ میں اور میرا کزن جلیل مرحوم سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بس میں دو تین سیٹیں بھی خالی تھیں۔ گروپ دس بارہ لڑکوں کا تھا، بس میں سوار ہوا اور میرے کزن جلیل سے کہا سیٹ چھوڑو، ہم بیٹھیں گے۔ جلیل تو اٹھ گیا مگر میں نے اٹھنے سے انکار کیا تو شہنشاہ حسین نے اپنا تعارف کروایا کہ NED کا دادا ہوں۔ میں نے کہا میں کیا کروں اور اس نے آنکھیں نکالی اور مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ لانڈھی والوں کا ایک کلچر تھا اور شاید اب بھی ہو جب کوئی باہر والا ناجائز اور کسی کو پریشان کرتا ہے وہ مظلوم کے حامی بن جاتے ہیں، بس کے مسافر میری حمایت میں بول پڑے اور میرے ساتھ ہو گئے۔ میں شہنشاہ حسین کو کو گھسیٹ کر لیڈیز کمپارٹمنٹ میں لے گیا، وہاں پر جوابی وار کیے اور پٹائی کیا ور خواتین نے بھی ساتھ دیا۔ شہنشاہ حسین کے ساتھیوں کو لیڈیز کمپارٹمنٹ میں آنے نہیں دیا اور موقع ملنے پر شہنشاہ پارٹی کو ایک آدھ ہاتھ جڑ دیا۔ میں اور میرے کزن نے ہوشیاری کی کہ چند روز کے لئے بس اسٹاپ تبدیل کر لیا کہ وہ بس اسٹاپ پر اپنے ٹولے کے ساتھ آتا رہا مگر اسے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ روزانہ سفر کرنے والے لڑکے اور دیگر افراد، خواتین اور مرد شہنشاہ ٹولے کو دیکھ کر ہنستے تھے اور ٹاؤنٹ کرتے تھے۔ 'لانڈی والا' تمھارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ بہر حال NED اور DJ میں اطلاع پہنچی تو شہنشاہ کی بڑی سبکی ہوئی۔ اس واقعہ کو گزرے ہوئے دو، تین سال ہوئے ہوں گے۔ ایک دن میں واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے ایکسن جو ہمارے عزیز تھے کے دفتر گیا۔ ان سے ملاقات کر کے باہر نکلا تو شہنشاہ حسین، نقوی خان صاحب کے دفتر میں داخل ہو رہے تھے، باہر چپڑاسی سے پوچھا 'یہ کون ہے؟' کیوں آیا ہے؟ چپڑاسی بھی ایک گھاگ اور تیز اور طرار شخص تھا، کہا کہ تم نہیں جانتے؟ یہ ولی بھائی صاحب کا بیٹا ہے۔ والد صاحب کا غصہ KDA میں بہت مشہور تھا۔ اس دور کے تمام انجینئر سے دوستی اور دعا سلام تھی۔ بہت سے لوگ حیدر آباد دکن کے حوالے سے اور بہت سے حیدر آباد کالونی کی وجہ سے جانتے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ شہنشاہ کی "دادا گیری" NED کے ساتھ ختم ہو گی۔

پھل فروش "دادا"

خلیل دادا: کورنگی نمبر 6 کی مارکیٹ کا پھل فروش تھا۔ جس نے آوارہ لڑکوں کا ایک گروپ بنالیا تھا اور اس وقت کے بڑے بدمعاش 'اصغر لنگڑے' کا آلہ کار بھی تھا۔ اس کے کچھ چیلے گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ صبح آفس اور اسکولوں کے اوقات میں دھما چوکڑی کرتے تھے اور لوگوں پر فقرے بازی کرتے تھے۔ خصوصاً خواتین اور طالبات پر۔ لوگ بڑے تنگ تھے۔ پولیس والے بھی ان کو کچھ نہیں کہتے تھے ایک دن ایک صاحب نے ان نکمے لڑکوں کو منع کرنے کی کوشش کی۔ جس پر آوارہ لڑکوں کا گروپ شریف آدمی سے الجھ پڑا اور مار پٹائی شروع کر دی۔ کچھ محلے والے دوست جو صدر جانے کے لیے کھڑے تھے اور میں ان بدمعاشوں پر پل پڑے۔ اللہ کے کرم سے ہم نے اس آوارہ ٹولے کو مار پیٹ کر بھگا دیا دوسرے دن خلیل دادا اپنے شاگردوں کو لے کر آیا اور مجھے شناخت کر کے کہا مجھے جانتے نہیں ہو؟ کیوں مارا؟ میرا دماغ ایک دم گھوم گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پوری قوت سے اس پر حملہ کر دوں۔ اللہ مالک ہے۔ لوگ میری مدد کو ضرور آئیں گے۔ میں نے دادا صاحب کی دھنائی شروع کر دی۔ اہل اسٹاپ بیچ بچاؤ کے بہانے اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ معاملہ ون ٹو ون ہو گیا۔ میں نے اس کا دماغ درست کر دیا۔ اتنے میں پولیس والے آ گئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کروایا اور خلیل کو ڈانٹا اور آئندہ اسٹاپ پر آنے سے منع کیا اور کہا تم علاقے میں بدمعاشی مت کرو اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہا ان لوگوں کے منہ نہ لگو۔ آئندہ اسٹاپ نہیں آئیں گے۔ یہ بات مارکیٹ والوں تک پہنچی تو انہوں نے بھی اس کی دادا گیری کو چیلنج کیا۔ اس کے علاوہ علاقے کے بااثر افراد نے بھی اس گروپ کو وارننگ دی جس کے بعد خلیل دادا کی دادا گیری ختم ہو گئی یعنی ایک عدد شیر اٹلی انجام کو پہنچا۔